جون ۱۹۹۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

- سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتیں
  تاریخ کا تقابلی مطالعہ
- حزب اللہ کی مسنون تنظیمی اساس
  امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

KHALID TRADERS

IMPORTERS – INDENTORS – STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER – SMALL TO SUPER – LARGE

AUTHORIZED AGENTS
NTN
BEARINGS

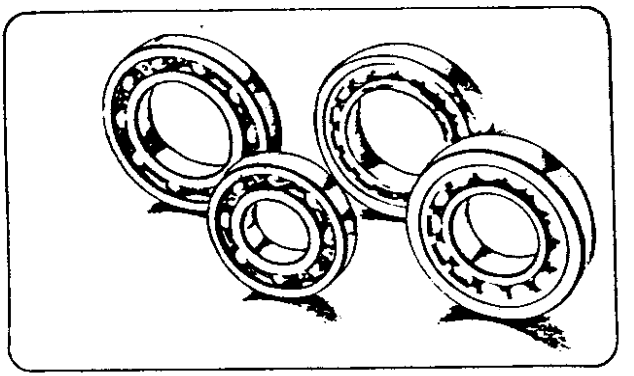

PLEASE CONTACT

TEL : 7732952-7735883-7730593
G.P.O. BOX NO. 1178, OPP KMC WORKSHOP
NISHTER ROAD, KARACHI-74200 (PAKISTAN)
TELEX : 24824 TARIQ PK CABLE : DIMAND BALL FAX : 7734776

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : Sind Bearing Agency 64 A-65,
Manzoor Square Noman St. Plaza Quarters Karachi-74400 (Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : **(Opening Shortly)** Amin Arcade 42, Brandreth Road, Lahore-54000 Ph : 54169

GUJRANWALA : 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (القرآن)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل کو اور اس کے اُس میثاق کو یاد رکھو جو اُس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی۔

جلد: ۴۲
شمارہ: ۶
ذوالحجہ ۱۴۱۳ھ
جون ۱۹۹۳ء
فی شمارہ ۵/-
سالانہ زرتعاون ۵۰/-

ماہنامہ میثاق لاہور

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

سالانہ زرتعاون برائے بیرونی ممالک

برائے سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، متحدہ عرب امارات اور بھارت ۳۰۰ سعودی ریال یا ۸۰ امریکی ڈالر
یورپ، افریقہ، سکنڈے نیوین ممالک جاپان وغیرہ۔ ۱۱۰ امریکی ڈالر
شمالی وجنوبی امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ۔ ۱۴۰ امریکی ڈالر
ایران، عراق، اومان، مسقط، ترکی، شام، اردن، بنگلہ دیش، مصر۔ ۶۰ امریکی ڈالر

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ادارہ تحریر
شیخ جمیل الرحمٰن
حافظ عاکف سعید
حافظ خالد محمود خضر

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور رجسٹرڈ

مقام اشاعت: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۵۴۷۰۰ - فون: ۸۵۶۰۰۳-۸۵۶۰۰۴

سب آفس: ۱۱۔ داؤد منزل، نزد آرام باغ شاہراہ لیاقت کراچی - فون: ۲۱۶۵۸۶

پبلشر: ناظم مکتبہ، مرکزی انجمن، طابع: رشید احمد چودھری، مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

☆ عرض احوال ——— ۳

حافظ عاکف سعید

☆ تذکرہ و تبصرہ ——— ۵

سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں -- تاریخ کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ الہدیٰ (قسط ۸۵) ——— ۲۰

اہل ایمان کے لئے ابتلاء و آزمائش:

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں (۲)

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ حزب اللہ کی مسنون تنظیمی اساس ——— ۳۱

بسلسلہ منہج انقلاب نبوی ﷺ

ڈاکٹر اسرار احمد

☆ کتابیات ——— ۴۳

پندرہواں کبیرہ: روزہ خوری

ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

☆ بحث و نظر ——— ۴۹

چہرے کا پردہ

نعیم صدیقی

☆ افکار و آراء ——— ۶۵

○ یہودی سرمایہ دار - پاکستان کے لئے عظیم خطرہ — ڈاکٹر محمد اسلم قاضی

○ عالمی امن کے قیام کا واحد راستہ — اعزاز مسرور

☆ رفتار کار ——— ۷۱

○ متحدہ عرب امارات میں ریفریشر کورس اور امیر تنظیم کا مختصر دورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض احوال

اب سے چند روز پیشتر تک پوری قوم کی نگاہیں سپریم کورٹ کی جانب مرکوز تھیں اور عدالت کے متوقع فیصلے کے بارے میں ہر طرح کی قیاس آرائیاں کی جارہی تھیں۔ بالآخر سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سنایا' قومی اسمبلی بحال ہوگئی اور نواز شریف صاحب ایک مرتبہ پھر وزارت عظمیٰ کی مسند پر رونق افروز ہوگئے۔ بلاشبہ یہ اس اعتبار سے ایک تاریخی فیصلہ تھا کہ اس سے عدلیہ کا وقار بلند ہوا' بدنامی کے داغ دھبے دھل گئے اور ڈھیروں نیک نامی اس کے حصے میں آئی۔ عدالت عظمیٰ کے اس فیصلے کا ملک گیر سطح پر خیرمقدم کیا گیا' نواز شریف صاحب ایک مقبول عوامی لیڈر اور کامیاب سیاست دان کے طور پر ملکی افق پر ستارہ بن کر چمکے اور حالیہ سیاسی بحران ان کے سیاسی عروج کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ تاہم جیسا کہ بعض سیاسی زعماء کا خیال ہے' اور امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی رائے بھی یہی ہے کہ عدالت کے اس فیصلے پر اگرچہ قوم نے بحیثیت مجموعی اطمینان کا سانس لیا لیکن اس سے وہ خوفناک سیاسی بحران ہرگز ختم نہیں ہوا جس نے صدر غلام اسحاق خاں اور وزیراعظم نواز شریف کے باہمی اختلافات کے باعث جنم لیا تھا اور جس نے اس درجے شدت اختیار کی کہ تنگ آمد بجنگ آمد کے مصداق صدر صاحب نے قومی اسمبلی توڑ ڈالی اور وزیراعظم کو معزول کرنے کا اعلان کردیا۔ صدر صاحب نے اگرچہ عدالتی فیصلے کو قبول کرنے کا اعلان کرکے ایک مستحسن قدم اٹھایا ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ اختلافات کی آگ سرد نہیں ہوئی بلکہ بعید نہیں کہ اس عدالتی فیصلے سے اس کی آنچ میں مزید اضافہ ہوگیا ہو۔ اس شبہ کو صدر صاحب کے اس تازہ ترین اقدام سے تقویت ملتی ہے کہ کل مورخہ ۲۰ر مئی کو گورنر پنجاب نے وزیراعلیٰ جناب منظور وٹو کے مشورے سے صدر صاحب کے کہنے پر پنجاب اسمبلی توڑنے کا اعلان کرکے صوبائی سطح پر شدید سیاسی بحران پیدا کردیا۔ وٹو صاحب خود نگران وزیراعلیٰ کا چارج سنبھال کر پنجاب میں صدر صاحب کی نمائندگی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ ملک کے دیگر صوبوں کی اسمبلیوں کا حال بھی قابل رشک نہیں ہے۔

یہ خوفناک سیاسی بحران اس اعتبار سے حل ہوتا دکھائی نہیں دیتا کہ مرکز میں اگرچہ

نواز شریف صاحب کی حکومت ہے لیکن ملک کے چاروں صوبوں کی صوبائی حکومتوں پر صدر غلام اسحاق خان کی اجارہ داری ہے اور مرکز میں بھی وہ آٹھویں ترمیم کی تلوار کے ساتھ وزیراعظم نواز شریف کے سر پر مسلط ہیں۔ اس صورت حال کا واحد حل یہی ہے کہ ملک میں نئے انتخابات کرائے جائیں اور انہیں غیرجانبدارانہ اور منصفانہ بنانے کے لئے ہر ممکن قدم اٹھایا جائے۔ بصورت دیگر صدر اور وزیراعظم کی یہ رسہ کشی قوم کو کسی نئے مارشل لاء کی طرف دھکیل سکتی ہے جس کے خوفناک نتائج و عواقب محتاج بیان نہیں!

تاہم نواز شریف صاحب اگر اس جنگ میں کامیاب ہوگئے اور انہوں نے صدر صاحب کو شکست دے دی' جس کے لئے جس بڑے پیمانے پر دو طرفہ ہارس ٹریڈنگ ہوگی اس کا تصور بھی سوہان روح ہے' تو وہ ایک بہت بڑی سیاسی قوت بن کر ابھریں گے اور بلاشرکت غیرے' اس ملک پر حکمرانی کریں گے اور پھر وہ کاروبار حکومت چلانے میں ہر طرح سے آزاد ہوں گے۔ یہ آزادی کیا رنگ دکھائے گی اس کے بارے میں کچھ کہنا قبل از وقت ہے۔ لیکن ایک چیز جو ان کے سابقہ طرز عمل اور حالیہ بیانات سے صاف جھلکتی دکھائی دیتی ہے' یہ ہے کہ ملک میں اسلامی نظام کا قیام ان کی اولین ترجیح ہرگز نہیں ہے بلکہ ان کے حق میں عدالت عظمیٰ کا فیصلہ آجانے کے بعد انہوں نے جو تقاریر کی ہیں ان میں اسلامی نظام کے قیام کے فیصلے کو جس طرح انہوں نے نظرانداز کیا ہے' اس کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ معاملہ اب ان کی ترجیحات کی فہرست میں سرے سے شامل ہی نہیں ہے۔ وہ پاکستان کو سنگاپور کے طرز کا ایک ملک بنانا چاہتے ہیں جو مادی اور ظاہری ترقی میں یورپ کے ہم پلہ ہو۔ لیکن اس کے لئے جس بڑے پیمانے پر سرمایہ اور زرمبادلہ درکار ہوگا اس کے حصول کا واحد ذریعہ یہ ہے کہ وہ پورے طور پر امریکہ کی دی ہوئی پالیسیوں کے تحت حکومت چلائیں اور یہودی سرمایہ داروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہ جائیں۔ تبھی اس بات کا امکان ہوگا کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جو کلیتہ یہودیوں کے اختیار میں ہیں' پاکستان کے لئے اپنی تجوریوں کے دروازے وا کریں۔ اس سے قبل افغانستان اور کشمیر کے معاملے میں نواز شریف حکومت نے جس طرح سے امریکی دباؤ کے آگے گھٹنے ٹیکے ہیں وہ کسی سے ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر یہاں کھلے سیکولرازم کا راج ہوگا' حقیقی اسلامی نظام کے نفاذ و قیام کا معاملہ کچھ عرصے کے لئے طاق

(باقی صفحہ ۷۷ پر)

تذکرہ وتبصرہ

سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں

تاریخ کا تقابلی مطالعہ

ڈاکٹر اسرار احمد

قرآن حکیم میں ناموں کی صراحت کے ساتھ تو صرف پچیس انبیاء اور رسولوں کا ذکر کیا گیا ہے' البتہ بعض نبیوں کا تذکرہ بغیر نام لئے بھی وارد ہوا ہے۔ مزید برآں یہ اصولی بات بھی دو مقامات پر بیان ہوئی ہے کہ ایسے بھی بہت سے رسول دنیا میں گذرے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا' (جیسے مثلاً سورۃ النساء کی آیت ۱۶۴ اور سورۂ غافر کی آیت ۷۸ میں)۔ پھر یہ اصول بھی دو ہی مرتبہ ذرا سے لفظی فرق کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ لِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ "ہر قوم کے لئے ہادی بھیجے گئے" (سورۃ الرعد آیت ۷) اور اِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ "کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی خبردار کرنے والا نہ آیا ہو" (سورۂ فاطر آیت ۲۴)۔ چنانچہ بعض روایات کے مطابق انبیاء کی تعداد اتنی ہی رہی ہے جتنے مسلمان حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضور ﷺ کے ساتھ تھے یعنی ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ' اور رسولوں کی کل تعداد اتنی تھی جتنی تعداد میں جان نثار صحابہؓ غزوۂ بدر میں آپؐ کے ہم رکاب تھے' یعنی تین سو تیرہ - واللہ اعلم!

اس سے قطع نظر کہ دنیا میں جو رسول مبعوث ہوئے ان کی کل تعداد کتنی ہے اس امر پر تقریباً اجماع ہے کہ ان میں سے صرف پانچ سورۃ الاحقاف کی آیت ۳۵ میں وارد شدہ اصطلاح کے مطابق "اولوالعزم" ہیں۔ یعنی حضرت نوح' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ' حضرت عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام اور سید المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ چنانچہ ان ہی کا تذکرہ سورۃ الشوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ میں وارد ہوا ہے۔ پھر ان میں سے بھی صرف دو ہیں جنہیں کتاب اور شریعت سے نوازا گیا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم۔ اس لئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ضمن میں تو کسی صحیفے کا ذکر تک کہیں موجود نہیں ہے' "صحفِ ابراہیمؑ" کا ذکر اگرچہ قرآن میں ہے (سورۃ النجم

آیت ۳۷ اور سورۃ الاعلیٰ آیت ۱۹) لیکن غالباً انہیں "کتاب" اس لئے نہیں قرار دیا گیا کہ ان میں کوئی شریعت درج نہیں تھی۔ (راقم کو بعض لوگوں کے اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہندوؤں کے اپنشدوں میں سے بعض صحفِ ابراہیمؑ کی بگڑی ہوئی اور تحریف شدہ صورتیں ہیں' تاہم ان میں بھی توحید کا بیان تو بلند ترین سطح پر بھی موجود ہے' احکام اور شریعت کا کوئی وجود نہیں ہے!) اسی طرح زبور اور انجیل کو بھی اگرچہ عرف عام میں کتابیں کہہ دیا جاتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ مستقل بالذات کتابیں نہیں تھیں بلکہ تورات ہی کے ضمیموں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ چنانچہ زبور صرف حمد اور مناجاتِ باری تعالیٰ کے ترانوں پر مشتمل ہے' اور انجیل صرف حکمت اور موعظت پر! گویا وہ آسمانی کتابیں جن کے ذریعے نوع انسانی کو شریعتِ خداوندی عطا ہوئی دو ہی ہیں یعنی اولاً تورات جو بنی اسرائیل کے لئے ہدایت قرار دی گئی (سورۂ بنی اسرائیل آیت ۲ اور سورۃ السجدہ آیت ۲۳) اور ثانیاً قرآن حکیم جو پوری نوع انسانی کے لئے ہدایت ہی نہیں "الہدیٰ" قرار پایا۔

چنانچہ صاحب کتاب و شریعت مسلمان امتیں بھی پوری تاریخِ انسانی کے دوران دو ہی ہوئی ہیں یعنی: ایک سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل اور دوسری موجودہ امت مسلمہ یعنی اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اور چونکہ اس وقت دنیا کے حالات تیزی کے ساتھ جو رخ اختیار کر رہے ہیں اور مستقبل میں جو حوادث و واقعات پیش آنے والے ہیں ان کے ضمن میں ان دونوں امتوں کی باہمی آویزش اور ان کے آخری انجام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے اس قانونِ عذاب کو فیصلہ کن عامل کی حیثیت حاصل ہے جس پر گذشتہ ہفتے مفصل گفتگو ہو چکی ہے' لہٰذا ان دونوں کے بعض مشترک اور بعض مابہ الامتیاز خصائص کے علاوہ ان کے ماضی اور حال کا مختصر جائزہ ضروری ہے تاکہ مستقبل کے بارے میں جو اشارات قرآن حکیم میں وارد ہوئے ہیں اور جو تفصیلی پیشینگوئیاں احادیث نبویہؐ میں بیان ہوئی ہیں ان کو صحیح پس منظر میں سمجھا جا سکے۔ اور اس طرح ایک جانب حدیثِ نبویؐ اور جناب صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشینگوئیوں کی عظمت اور حقانیت پر دل مطمئن ہو جائیں اور دوسری جانب پیش آنے والے حوادث و واقعات پر ذہن کا رد عمل تحیر اور استعجاب کا نہ ہو بلکہ وہ ہو جو سرمد کے اس مصرعے میں بیان ہوا کہ: ع "بیا بیا من ترا خوب می شناسم!"

بنی اسرائیل کی تاریخ کا آغاز اگرچہ ویسے تو لگ بھگ ۱۸۰۰ قبل مسیحؑ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پوتے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے سے ہوتا ہے؛ اس لئے کہ انہی کا لقب اسرائیل یعنی "اللہ کا بندہ" تھا اور بنی اسرائیل ان ہی کی اولاد ہیں، لیکن ان کو امت مسلمہ کی حیثیت تقریباً ۱۳۵۰ ق م میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں حاصل ہوئی جب انہیں تورات عطا ہوئی اور ان سے کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامنے اور شریعت خداوندی پر کاربند رہنے کا وہ پختہ عہد و میثاق لیا گیا جس کا ذکر قرآن مجید میں بار بار بہت شدومد سے آتا ہے۔ بہرحال اس وقت سے لے کر ساتویں صدی عیسوی کے آغاز تک جب خاتم النبیین اور سیدالمرسلین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی، گویا لگ بھگ دو ہزار برس تک، بنی اسرائیل ہی کو اس دنیا میں کتابِ الٰہی کی امین اور شریعتِ خداوندی کی حامل امتِ مسلمہ کی حیثیت حاصل رہی۔ تاآنکہ ۶۲۴ء میں تحویل قبلہ کو بنی اسرائیل کی معزولی اور نئی امت یعنی امتِ محمد ﷺ کے اس منصب پر فائز کئے جانے کی علامت بنا دیا گیا۔ چنانچہ اس کے بعد سے تاقیامِ قیامت امتِ محمد ﷺ ہی کتاب و شریعت کی حامل و امین اور روئے ارضی پر اللہ کی نمائندگی کی ذمہ دار ہے!

کتابِ الٰہی کے امین اور شریعتِ خداوندی کے حامل ہونا بجائے خود۔

"یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!"

کے مصداق ایک بہت بڑا درجہ فضیلت ہے جو ان دونوں امتوں کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں دو بار یہ آیتِ مبارکہ سابقہ امتِ مسلمہ کے ضمن میں وارد ہوئی:

یٰبَنِیٓ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡٓ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ وَاَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ۝

"اے بنی اسرائیل یاد کرو میرے اس انعام کو جو میں نے تم پر کیا۔ اور میں نے تو تمہیں تمام جہانوں (یعنی تمام جہان والوں) پر فضیلت دیدی تھی!" (سورۃ البقرہ آیات ۴۷ اور ۱۲۲)۔

لیکن امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ایک مزید درجۂ فضیلت اس بنا پر حاصل ہے کہ چونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت و رسالت اپنے نقطۂ عروج اور درجۂ کمال کو پہنچ

کر ختم ہو گئیں اور آپؐ کی بعثت تمام سابق انبیاء و رسل کے مانند صرف اپنی اپنی قوموں کی جانب نہیں' بلکہ پوری نوع انسانی کی جانب ہوئی' جیسے کہ فرمایا سورۂ سبا کی آیت ۲۸ میں کہ:

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا

"ہم نے نہیں بھیجا آپؐ کو مگر تمام انسانوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر!"

لہٰذا آپؐ کی امت گویا اجتماعی طور پر تاقیامِ قیامت فریضہ رسالت کی امین بھی ہے۔ یعنی اس کی ذمہ داری سابقہ امتِ مسلمہ کی طرح صرف یہی نہیں ہے کہ خود کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامے رہے اور شریعتِ خداوندی پر سختی سے کاربند رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ پوری نوع انسانی تک رسالتِ محمدیؐ کے پیغام کو پہنچانے کا حق ادا کرے اور پورے کرۂ ارضی پر اللہ کے دین کے غلبے یعنی عالمی سطح پر حکومت الٰہیہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے نظام کے قیام کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اس لئے کہ یہی از روئے قرآن نبیؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ہے۔ جیسے کہ قرآن حکیم میں تین بار فرمایا گیا:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّهٖ

"وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق دے کر تاکہ غالب کریں اسے (دین حق کو) پورے کے پورے دین (نظام زندگی) پر!" (سورۃ التوبہ آیت ۳۳' سورۃ الفتح آیت ۲۸ اور سورۃ الصف آیت ۹)

یہی وجہ ہے کہ امتِ محمد ﷺ کو "امتِ وَسَط" بھی قرار دیا گیا جس کا فرض پوری نوعِ انسانی پر اللہ اور رسولؐ کی جانب سے شہادت یعنی اتمامِ حجت کا فریضہ ادا کرنا ہے (سورۂ بقرہ آیت ۱۴۳)۔ اور "خیرِ امت" یعنی بہترین امت کا خطاب بھی دیا گیا "جو پوری نوع انسانی کے لئے برپا کی گئی ہے" (سورۂ آل عمران آیت ۱۱۰) بقول علامہ اقبال ؎

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے!

درجۂ فضیلت کے اس فرق و امتیاز کے ساتھ ساتھ سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کے مابین ایک اور فرق و تفاوت یہ ہے کہ جہاں سابقہ امت مسلمہ ایک "یک نسلی امت" تھی وہاں چونکہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوع انسانی کی جانب ہے لہٰذا موجودہ امتِ مسلمہ ہمہ نسلی اور ہمہ قومی (Multinational) امت ہے۔ مزید برآں درجۂ

فضیلت کے اعتبار سے خود یہ بھی دو حصوں میں منقسم ہے جن کا صراحت کے ساتھ ذکر سورۃ الجمعہ میں کر دیا گیا ہے' یعنی ایک "امیین" یعنی بنی اسمٰعیلؑ اور ان کے تابع اہل عرب' اور دوسرے "آخرین" یعنی ان کے سوا تمام نسلوں اور جملہ اقوام عالم میں سے ایمان لانے والے مسلمان! اور ان میں سے امیین کو ان دو اسباب کی بنا پر بہت بڑا درجہ فضیلت حاصل ہے کہ (۱) خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ان ہی میں سے تھے۔ جیسے کہ فرمایا سورۃ الجمعہ کی دوسری آیت میں:

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ

"وہی ہے (اللہ) جس نے اٹھایا امیوں میں ایک رسول (محمدؐ) ان ہی میں سے!"

——— چنانچہ یہ تو ع "یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا!" کے مصداق وہ فضیلت ہے جس پر اہلِ عرب جتنا ناز کریں کم ہے! اور (۲) یہ کہ اللہ نے ان ہی کی زبان میں اپنا آخری کلام اور نوع انسانی کے نام اپنا آخری پیغام نازل فرمایا' جس کا فہم ان کے لئے نہایت آسان ہے۔ بقول علامہ اقبال۔

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ اُو رحمتٌ لِلعالمیں!

یہ پوری بحث اس اعتبار سے تو یقیناً بڑی خوش آئند بھی ہے اور دل پسند بھی کہ ہمیں بحیثیتِ امت محمد ﷺ سابقہ امتِ مسلمہ پر بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کا ایک منطقی نتیجہ نہایت تلخ ہے۔ یعنی اولاً ع "جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!" کے عام اور معقول اصول کے مطابق اور ثانیاً خود قرآن حکیم کی اس نص کی رُو سے جو سورۃ الاحزاب میں نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات سے خطاب کے ضمن میں وارد ہوئی ہے یعنی:

یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ

"اے نبی کی گھر والیو' تم عام عورتوں کے مانند نہیں ہو" (آیت ۳۲)

مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ

"اگر تم میں سے کسی نے کسی صریح بے حیائی کا ارتکاب کیا تو اسے (دوسروں کے مقابلے میں) دگنا عذاب دیا جائے گا"۔ (آیت ۳۰)

یہ ناقابل تردید نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ کسی جرم کی جو سزا بنی اسرائیل کو دی گئی اسی جرم کا

ارتکاب موجودہ امت مسلمہ کرے گی تو اس کے مقابلے میں دوہرے تہرے ہی نہیں بیسیوں گنا عذاب کی مستحق ہو گی۔ اور خود امت مسلمہ میں سے سورۃ النور میں وارد شدہ الفاظ وَالَّذِیْ تَوَلّٰی کِبْرَہٗ مِنْھُمْ "اور وہ جو والی ہوا اس کے سب سے بڑے حصے کا" (آیت ۱۱) کے مطابق اس عذاب کی شدید ترین صورت کے مستحق مسلمانانِ عالمِ عرب ہوں گے!

مندرجہ بالا اصولی نتائج کو ذہن میں جاگزیں کرنے کے بعد اب آیئے کہ پہلے ہم سابقہ امتِ مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی تاریخ کے بعثتِ نبویؐ تک کے دور پر ایک نظر ڈال لیں۔

بنی اسرائیل کی تاریخ کے اس دو ہزار سالہ دور کا وہ خلاصہ جو نئی امتِ مسلمہ یعنی امتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی سبق آموزی اور عبرت پذیری کے لئے کافی تھا کمالِ فصاحت اور غایتِ اختصار کے ساتھ قرآن حکیم میں سورۂ بنی اسرائیل کے پہلے رکوع کی چھ (۲ تا ۷) اور آخری رکوع کی چار (۱۰۱ تا ۱۰۴) یعنی کل دس آیات میں بیان کر دیا گیا ہے جس کا لبِ لباب یہ ہے کہ قرآن حکیم کے نزول کے زمانے تک بنی اسرائیل پر چار دور گزر چکے تھے: دو دور عروج کے جن کے دوران ان کا طرزِ عمل بھی دینی و اخلاقی اعتبار سے درست رہا اور انہیں دنیا میں عزت و سربلندی بھی حاصل رہی اور وہ کثرتِ اموال و اولاد کی صورت میں اللہ تعالیٰ کے انعامات سے بھی بہرہ ور ہوتے رہے ___ اور دو ہی دور زوال کے جن کے دوران انہوں نے نفس پرستی اور بغاوت کی روش اختیار کی، جس کے نتیجے میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور غیر اقوام کے ہاتھوں وہ خود بھی ذلیل و خوار اور مفتوح و مغلوب ہوئے اور ان کے دینی و روحانی مرکز یعنی ہیکلِ سلیمانی کی حرمت بھی پامال ہوئی _____ تاہم اگر اس کی کسی قدر وضاحت تاریخی اور زمانی ترتیب کے ساتھ کی جائے تو وہ حسب ذیل ہے:

۱- ان کے پہلے دورِ عروج کا آغاز حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفۂ اول حضرت یوشع بن نون کی قیادت میں فلسطین کی فتح سے ہوا اور تقریباً تین سو سال تک نشیب و فراز کے مراحل طے کرتا ہوا یہ دورِ سعادت حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے عہدِ حکومت میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچا جو تاریخ بنی اسرائیل کے عہدِ زریں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲- حضرت سلیمانؑ کے انتقال کے ساتھ ہی ان کے پہلے دورِ زوال کا آغاز ہو گیا، اس

لئے کہ فوراً ہی ان کی سلطنت دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ بہرحال تقریباً تین سو سال ہی میں یہ عہدِ زوال بھی اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ چنانچہ اولاً شمال سے آشوریوں نے شمالی سلطنت اسرائیل کو تاخت و تاراج کیا اور بالآخر ۵۸۷ء قبلِ مسیح میں مشرق (عراق) سے آنے والے نبوقدنضر (بخت نصر) کے حملے نے نہ صرف یہ کہ پوری جنوبی سلطنتِ یہودیہ کو تہس نہس کر کے رکھ دیا بلکہ یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجا دی' لاکھوں افراد کو قتل کیا' چھ لاکھ یہودی مردوں' عورتوں اور بچوں کو بھیڑوں اور بکریوں کے گلوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا ____ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہیکل سلیمانی کو کلیۃً مسمار کر دیا حتیٰ کہ اس کی بنیادیں تک کھود ڈالیں! _____ بابل کی لگ بھگ سو سالہ اسیری کا دور بنی اسرائیل کی ذلت و رسوائی کا شدید ترین زمانہ ہے!

۳ - بنی اسرائیل کے دوسرے دور عروج کا آغاز بابل کی اسیری سے شہنشاہِ فارس سائرس یا کیخورس یا ذوالقرنین کے ہاتھوں نجات کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً ساڑھے چار سو سال قبل حضرت عزیر علیہ السلام کی تجدیدی و اصلاحی مساعی سے ہوا اور دوسری خوشحالی یا سربلندی کا یہ دور بھی لگ بھگ تین سو سال جاری رہا اور اس کا مظہرِ اعظم وہ مکابی سلطنت تھی جو تقریباً ۱۷۰ ق م سے ۶۷ ق م تک نہایت دبدبہ اور شان و شوکت کے ساتھ قائم رہی اور جس نے ایک بار پھر حضرت داؤد اور سلیمان (علیہما السلام) کے دور کی یاد تازہ کر دی۔

۴ - بنی اسرائیل کا دوسرا دورِ زوال ۶۳ ق م میں رومی فاتح پومپئی کے ہاتھوں یروشلم کی فتح سے شروع ہوا اور تاحال جاری ہے۔ اس کے دوران ان کی تاریخ میں دوسری بار ان پر عذابِ الٰہی کے سخت کوڑے برسے' چنانچہ ۷۰ء میں رومی جرنیل ٹائیٹس نے دوبارہ یروشلم شہر اور ہیکلِ سلیمانی کو مسمار کیا اور ایک دن میں ایک لاکھ ۳۳ ہزار یہودیوں کو تہہِ تیغ کر ڈالا اور ۶۷ ہزار کو غلام بنا لیا۔ اور اس دن سے جو یہودی اثر و رسوخ سرزمین فلسطین سے ختم ہوا تو لگ بھگ انیس سو برس تک انہیں وہاں سر اٹھانے کا موقع نہ ملا۔ بلکہ پورے چھ سو برس تو اس سرزمین میں ان کا داخلہ بھی بند رہا۔ رہا ان کا ہیکلِ مقدس تو وہ آج تک دوبارہ تعمیر نہ ہو سکا۔ بعد میں رومی شہنشاہ ہیڈریان نے یروشلم شہر کو دوبارہ تعمیر کیا تو اس کا نام بھی یروشلم نہیں "ایلیا" رکھا۔

اُمّتِ مسلمہ کے عروج وزوال کا ایک اجمالی خاکہ

ایک حدیثِ مبارک کے پس منظر میں

امام ترمذیؒ نے حضرت عبداللہؓ ابن عمروؓ ابن العاص سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

لَیَاتِیَنَّ عَلٰی اُمَتِی مَا اَتٰی عَلٰی بَنِی اِسرائیلَ حَذوَ النَّعلِ بِالنَّعلِ

"میری امت پر بھی لازماً وہ تمام حالات وارد ہوں گے جو بنی اسرائیل پر واقع ہوئے بالکل ایسے ہوبہو جیسے (ایک جوڑے کی) ایک جوتی دوسری جوتی سے مشابہ ہوتی ہے!"

اب سے لگ بھگ اٹھارہ برس قبل ان سطور کا راقم مسجد خضراء سمن آباد میں اعتکاف کی حالت میں امتِ مسلمہ کے ماضی' حال اور مستقبل کے بارے میں غور کر رہا تھا کہ اچانک یہ حدیث مبارکہ ذہن میں بجلی کی طرح کوند گئی اور اس نے بعینہٖ وہ کام کیا جو ایک بہت بڑے خزانے کو کھولنے کے لئے ایک چھوٹی سی کنجی کرتی ہے۔ چنانچہ فوراً امت کی چودہ سو سالہ تاریخ کا ایک خاکہ نوشتۂ دیوار کی طرح نگاہوں کے سامنے آگیا اور یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ سابقہ امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی دو ہزار سالہ تاریخ کے جن چار ادوار کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدائی چند آیات میں ہوا ہے وہ ایک اعتبار سے ؎

"خوشتر آں باشد کہ سر دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں"

کے مصداق خود امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ کا پیشگی بیان ہے۔ اس سے جہاں اس حدیث مبارکہ کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوا وہاں اس حدیث نبویؐ کی حقانیت بھی مزید منکشف ہوئی جس میں آنحضور ﷺ نے قرآن حکیم کے بارے میں فرمایا ہے کہ:

فِیہِ نَبَأُ مَا قَبلَکُم وَ خَبَرُ مَا بَعدَکُم وَ حُکمُ مَا بَینَکُم

"اس میں تم سے پہلے کے لوگوں کے حالات بھی درج ہیں اور تمہارے بعد آنے والوں کے حالات کا ذکر بھی موجود ہے اور تمہارے مابین رونما ہونے والے جملہ

نزاعات کا فیصلہ بھی موجود ہے" (ترمذیؒ اور بیہقیؒ عن علیؓ ابن ابی طالب)۔

بہرحال ذیل میں امت مسلمہ کے عروج و زوال کا ایک اجمالی خاکہ تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ ایک طرف "عروج" کے ضمن میں ملتِ اسلامی کی عظمت و سطوت گزشتہ کی ایک جھلک سامنے آئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مطابق کہ ۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا!

مسلمان نوجوان کو معلوم ہو کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب عرب افواج جبرالٹر (جبل الطارق) سے شمال مشرق کی جانب بڑھتی ہوئی فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب ترک افواج پورے مشرقی یورپ کو روندتی ہوئی وی آنا کے دروازوں تک جا پہنچی تھیں۔ شاید کہ اسی طرح کچھ نوجوانوں کے دل میں ملتِ اسلامی کی تجدید اور اس کی عظمت و سطوت گزشتہ کی بازیافت کا جذبہ پیدا ہو جائے!—— اور دوسری طرف "زوال" کے ضمن میں یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ خدا کا عدل بے لاگ ہے اور اس کا قانون اٹل اور غیر مبدل۔ اس نے جو معاملہ سابق امت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کے ساتھ کیا بعینہٖ وہی ہمارے ساتھ کیا حتیٰ کہ ہماری اور ان کی تاریخ میں ایک حد درجہ حیرت انگیز مشابہت موجود ہے اس پہلو سے کہ یہود پر بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے دو دور آئے اور ہم پر بھی دو ہی دور آئے۔ اگرچہ امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی وسعت کی نسبت سے ہمارے نکبت و ادبار کے یہ دور بھی یہود کے مقابلے میں بہت طویل رہے اور جس طرح بنی اسرائیل کی تولیت کے زمانے میں بیت المقدس کے ناموس کا پردہ ۔

"اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انساں کی قبا چاک"

کے مصداق دو بار چاک ہوا اسی طرح ہمارے عہد تولیت میں بھی مسجد اقصیٰ کی حرمت دو ہی مرتبہ پامال ہوئی۔

امت مسلمہ کے عروج و زوال کے تاریخی خاکے کے ضمن میں دو باتیں پیشگی سمجھ لینی چاہئیں: ایک یہ کہ، جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے، اپنی ہیئت تشکیلی کے اعتبار

سے امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دو حصے ہیں۔ پہلا "امیین" یعنی بنی اسماعیل پر مشتمل ہے اور اسے اس امت کے قلب یا مرکز کی حیثیت حاصل ہے اور دوسرا "آخرین" یعنی دیگر اقوام پر مشتمل ہے خواہ وہ کرد ہوں یا ترک' اہلِ فارس ہوں یا اہلِ ہند' افغان ہوں یا مغل' اہلِ حبش ہوں یا بربر' شرقِ بعید یعنی ملایا اور انڈونیشیا سے تعلق رکھتے ہوں یا مغرب بعید یعنی مراکو اور موریطانیہ سے۔

دوسرے یہ کہ جغرافیائی اعتبار سے بھی عالمِ اسلام کو تین حصوں میں منقسم سمجھنا چاہئے' یعنی ایک قلب' دوسرے میمنہ اور تیسرے میسرہ۔ اگر دنیا کے نقشے کو سامنے رکھ کر عالمِ اسلام پر نگاہ جمائی جائے تو وہ ایک ایسے عقاب کے مانند نظر آئے گا جو اپنے دونوں بازوؤں کو پوری طرح پھیلائے محوِ پرواز ہو۔ جزیرہ نمائے عرب' عراق' فلسطین' شام اور ایشیائے کوچک جو عالمِ اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اس عقاب کے جسم کے مانند نظر آئیں گے جن میں سے ایشیائے کوچک کو اس کے سر اور چونچ سے مشابہت ہے اور جزیرہ نمائے عرب کے جنوبی حصے کو اس کے دم کے پھیلے ہوئے پروں سے۔ اس عقاب کا دایاں بازو (میمنہ) ایران' ترکستان' افغانستان اور برِصغیر ہند و پاک سے ہوتا ہوا ملایا اور انڈونیشیا تک پھیلا ہوا ہے اور بایاں بازو (میسرہ) پورے شمالی افریقہ کو لپیٹ میں لیتا ہوا سپین تک چلا گیا ہے۔

اب آیئے تاریخی خاکے کی طرف:

سن عیسوی کے حساب سے امت مسلمہ کی تاریخ کا آغاز ساتویں صدی سے ہوتا ہے' اس لئے کہ آنحضور ﷺ کی ولادت باسعادت ۵۷۱ء میں ہوئی۔ ۶۱۰ء میں آپؐ نے اپنی دعوت کا آغاز فرمایا اور محتاط ترین حساب کے مطابق اپریل ۶۳۲ء میں آپؐ جزیرہ نمائے عرب کی حد تک اسلامی انقلاب کی تکمیل فرما کر "رفیق اعلیٰ" سے جا ملے فصلی اللہ علیہ وبارک وسلم تسلیماً کثیراً۔ اصحابِ ثلاثہ یعنی حضرات ابوبکر صدیق' عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم کے عہدِ خلافت کے دوران "امیین" ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لے کر ایک سیلاب کے مانند جزیرہ نمائے عرب سے نکلے اور انہوں نے ایک ربع صدی سے بھی کم میں ایران و عراق' شام و فلسطین اور مصر کے علاوہ شمالی افریقہ کے بڑے رقبے پر اسلام کا پرچم لہرا دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں تو یہ

مل رکا رہا لیکن بنو امیہ کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی اس سیلاب نے دوبارہ آگے بڑھنا شروع کردیا اور تھوڑے ہی عرصے میں ایک طرف مشرق میں ترکستان' افغانستان اور سندھ تک اور دوسری طرف مغرب میں پورے شمالی افریقہ کے علاوہ سپین سمیت مغربی یورپ کا وسیع علاقہ "امیین" کے زیرِ نگیں آگیا اور عالمِ اسلام کی سرحدیں تین براعظموں تک وسیع ہوگئیں۔ یہی وہ زمانہ تھا جب عرب افواج اندلس سے پیش قدمی کرتے ہوئے فرانس کے عین قلب تک جا پہنچی تھیں۔

آٹھویں' نویں اور دسویں صدی عیسوی کا زمانہ عربوں کے عروج کا دور ہے جس کے دوران اسلام کی علمبرداری اور عالمِ اسلام کی سیادت دونوں "امیین" کی دو اہم شاخوں یعنی بنو امیہ اور بنو عباس کے پاس رہیں اور روئے ارضی کے ایک بڑے حصے پر ان کے دین و مذہب' ان کے تہذیب و تمدن' ان کے علوم و فنون اور ان کی شان و شوکت کا سکہ رواں رہا۔ لیکن جیسے جیسے دنیوی جاہ و جلال میں اضافہ ہوا' جذبات دینی اور حرارتِ ایمانی میں کمی آتی چلی گئی اور اس طرح یہ تناور درخت اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا گیا۔ اس اندرونی اضمحلال کے اثرات کے ظاہر ہونے میں کچھ مدت ضرور صرف ہوئی لیکن دسویں صدی عیسوی ہی کے دوران واضح ہوگیا تھا کہ عرب اپنے عالمِ پیری میں قدم رکھ چکے ہیں۔ گیارہویں صدی عیسوی کے دوران "امیین" کا انحطاط اور زوال اپنی آخری حدوں کو پہنچ گیا اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب میں قوت کا ایک خلا پیدا ہوگیا۔

خوش قسمتی سے قوت کے دباؤ میں اس کمی کے نتیجے میں عالمِ اسلام کی شمال مشرقی سرحدوں سے جو قبائل قلبِ اسلام کی طرف کھنچ کر آئے وہ پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے یعنی کرد اور ترکانِ سلجوقی جنہوں نے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شام' فلسطین اور مصر میں مضبوطی کے ساتھ قدم جمائے اور اس طرح عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت اور مدافعت کے لئے کسی قدر تازہ دم قوت فراہم ہوگئی۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران میں امت مسلمہ پر گویا عذاب خداوندی کے "وعدۂ اولیٰ" کا ظہور ہوا اور ہوبہو وہی نقشہ کھنچ گیا جس کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۵ میں تاریخ بنی اسرائیل کے پہلے دورِ عذاب کے ضمن میں آیا ہے۔ چنانچہ پہلے شمال سے صلیبی طوفان کے ریلے آنے شروع ہوئے اور ۱۰۹۹ء میں نہ صرف یہ

کہ مسجد اقصیٰ کے ناموس کا پردہ چاک ہوا بلکہ بیت المقدس میں وہ قتلِ عام ہوا جس کا تذکرہ کرتے ہوئے مغربی مؤرخین بھی کانپ جاتے ہیں۔ پورے اٹھاسی برس تک بیت المقدس پر صلیبیوں کا قبضہ رہا۔ اس لئے کہ دولتِ عباسی تو "مرنے والی امتوں کے عالمِ پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی' گویا "امیین" میں تو سرے سے دم خم باقی ہی نہ رہا تھا۔ بالآخر "آخرین" کے تازہ و گرم خون نے مجاہدِ کبیر صلاح الدین ایوبی کی سرکردگی میں ۱۱۸۷ء میں بیت المقدس کو صلیبیوں کے قبضے سے نجات دلائی اور اس طوفان کا رخ موڑا ------ اور پھر مشرق کی جانب سے آیا فتنۂ تاتار کا وہ طوفانِ عظیم جس نے پہلے افغانستان اور ایران کو پامال کیا اور ہر جگہ کشتوں کے پشتے لگا دیئے اور بالآخر ۱۲۵۸ء میں بغداد میں وہ تباہی مچائی کہ رہے نام اللہ کا۔ لاکھوں مسلمان تہ تیغ ہوئے' بغداد کی گلیاں خون کی ندیاں بن گئیں اور الف لیلہ کے اس رومانوی شہر کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور بعینہٖ وہ کیفیت پیدا ہوگئی جو کم و بیش دو ہزار سال قبل بخت نصر کے حملے سے بیت المقدس کی ہوئی تھی۔ نتیجۃً زوالِ ملکِ مستعصم امیر المومنین کے ساتھ ہی خلافت عباسی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بالکل گل ہوگیا اور نہ صرف یہ کہ امت مسلمہ پر عذابِ خداوندی کا یہ پہلا دور تکمیل کو پہنچا بلکہ کم از کم "امیین" کی حد تک تو وہ وعید بھی پوری ہوگئی جو سورۂ محمد ﷺ کی آیت ۳۸ میں وارد ہوئی تھی یعنی اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ "اگر تم پیٹھ موڑ لو گے تو (اللہ) تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو کھڑا کر دے گا!" چنانچہ وہ عالمِ اسلام کی سیادت و قیادت کے منصب سے معزول کر دیئے گئے۔ دو سال بعد یعنی ۱۲۶۰ء میں اس طوفان کا رخ بھی "آخرین" ہی نے پھیرا جس سے کم از کم اسلام کا مغربی بازو اس کی تاخت و تاراج سے محفوظ رہ گیا۔

بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی کے دوران عالمِ اسلام کا قلب بعینہٖ وہی نقشہ پیش کر رہا تھا جسے دیکھ کر کبھی حضرت عزیر علیہ السلام کی زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا "کیسے زندہ کرے گا اللہ اسے' اس کی موت کے بعد!" (البقرہ: ۲۵۹) لیکن پھر امت مسلمہ کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کی وہی شان ظاہر ہوئی جس کا ظہور بنی اسرائیل کے حق میں ہوا تھا صرف اس فرق کے ساتھ کہ چونکہ سابقہ امت مسلمہ ایک ہی نسل پر مشتمل تھی لہٰذا اس کی نشأۃِ ثانیہ کا یہ عمل بھی لامحالہ اسی

نسل کے اندر واقع ہوا، لیکن امت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معاملے میں یہ مجبوری نہ تھی، لہٰذا یہاں تجدید ملت کا یہ کام، "آخرین" کی مختلف اقوام سے لے لیا گیا۔ چنانچہ ؎

"ہے عیاں فتنۂ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے!"

کے مطابق نہ صرف یہ کہ خود انہی ترکان چنگیزی کا بڑا حصہ اسلام لے آیا جن کے ہاتھوں عالمِ اسلام پر ہولناک تباہی آئی تھی بلکہ انہی کے قبیل کے وحشی قبائل میں سے دو قبیلوں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ وہ حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور ان میں سے ایک یعنی ترکانِ تیموری نے ہندوستان میں ایک عظیم الشان مسلم سلطنت کی بنیاد رکھ کر عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی توسیع کی اور دوسرے یعنی ترکان عثمانی نے ابتداءً ایشیائے کوچک میں قدم جمائے اور پھر رفتہ رفتہ اس عظیم الشان مسلمان مملکت کی بنیاد رکھی جس نے ایک طرف پورے مشرقی یورپ پر اپنی بالادستی کا سکہ جمایا، یہاں تک کہ ایک موقع پر اٹلی کے دروازوں تک پر دستک دی اور دوسری طرف شمالی افریقہ سمیت پورے عالمِ اسلام کے قلب کی حفاظت و سیادت کی ذمہ داری سنبھالی تا آنکہ خلافت کا بھی احیاء کیا اور اس طرح گویا عالمِ اسلام کے قلب کی عظمت و سطوت گزشتہ پھرپوری طرح لوٹ آئی۔ اگرچہ عربوں کے ذریعے نہیں بلکہ ترکوں کے واسطے سے!

قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ ادھر تو خلافتِ عثمانی کے استحکام کے ذریعے عالمِ اسلام کے قلب میں گویا ملت کی نشأۃِ ثانیہ ہوئی اور ادھر یورپی استعمار کے سیلاب کی صورت میں امت مسلمہ پر عذابِ الٰہی کے دوسرے اور نہایت طویل دور کا آغاز ہوگیا جس کا اصل زور عالمِ اسلام کے میسرہ اور میمنہ کی جانب رہا۔

یہ ایک ناقابل تردید تاریخی حقیقت ہے کہ یورپ میں احیاء العلوم کا پورا عمل اسلام ہی کے زیرِاثر شروع ہوا اور یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے یورپ کو مشرق و مغرب کے علوم و فنون سے روشناس کرایا۔ لیکن جیسے ہی یورپ میں بیداری ہوئی اور وہاں قوت کا دباؤ بڑھا، گویا عالمِ اسلام کی شامت آگئی۔

یورپ مشرق و مغرب دونوں اطراف سے مسلمانوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا، لیکن

مشرق میں عذاب کے وعدۂ اولیٰ کے بعد نشأۃِ ثانیہ کا عمل ظاہر ہو چکا تھا اور عظیم سلطنتِ عثمانیہ عالمِ اسلام کے قلب کے محافظ سنتری کی حیثیت سے کھڑی تھی البتہ مغرب میں اب دولت ہسپانیہ "مرنے والی امتوں کے عالمِ پیری" کا نقشہ پیش کر رہی تھی۔ لہٰذا ع "ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات" کے مصداق یورپی استعمار کا اولین شکار وہی بنی اور پندرہویں صدی عیسوی کے دوران اس عظیم سلطنت کا قلع قمع ہوگیا۔ یہاں تک کہ ۱۴۹۲ء میں سقوطِ غرناطہ کے بعد تو بعینہٖ وہ صورت پیدا ہوگئی جس کا نقشہ قرآن مجید میں عذابِ استیصال کا نوالہ بننے والی قوموں کے بیان میں کھینچا جاتا ہے یعنی: كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا "جیسے کہ وہ کبھی وہاں آباد ہی نہ تھے" (سورۂ ہود: ۶۸ اور ۹۵) اور لَا تُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ "اب ان کے ویران مسکنوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا!" (سورۃ الاحقاف: ۲۵)

۱۴۹۸ء میں واسکوڈی گاما نے نیا بحری راستہ تلاش کیا اور اس کے فوراً بعد یورپی استعمار کا سیلاب عالمِ اسلام کے مہبط پر ٹوٹ پڑا اور انڈونیشیا' ملایا اور ہندوستان مختلف یورپی اقوام کے استبدادی پنجوں میں جکڑے گئے اور یہ عمل جس کا آغاز سولہویں صدی عیسوی سے ہوا' اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی میں عالمِ اسلام کے دائیں بازو کی حد تک اپنے عروج کو پہنچ گیا۔

اسی اثنا میں دولتِ عثمانی بھی اپنے شباب کے دور سے گزر آئی تھی اور اب اس نے بھی "مردِ بیمار" کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ گویا عالمِ اسلام کے قلب میں آٹھ صدیوں کے بعد پھر وہی قوت کا خلا پیدا ہوگیا جو گیارہویں صدی عیسوی میں دولتِ عباسیہ کے اضمحلال کے باعث پیدا ہوا تھا۔ اور قوت کے دباؤ کی اس کمی کے باعث مغربی استعمار کا رخ عالمِ اسلام کے قلب کی جانب مڑ گیا۔

عالمِ اسلام کے قلب پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کے اس دوسرے دور کا آغاز بیسویں صدی کے شروع میں ہوگیا تھا۔ چنانچہ پہلی عالمگیر جنگ کے خاتمے پر جب دنیا کا نیا نقشہ سامنے آیا تو معلوم ہوا کہ عظیم دولت عثمانیہ سمٹ سمٹا کر ایشیائے کوچک میں محدود ہوگئی اور شمالی افریقہ سمیت پورا عالمِ عرب چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں منقسم ہو کر مختلف یورپی اقوام کے براہِ راست زیرِ نگیں ہوگیا یا بالواسطہ محکومی میں آگیا اور ہوبہو وہی کیفیت پیدا ہوگئی جس کی خبر مخبرِ صادق ﷺ نے ان الفاظ میں دی تھی کہ:

یُوشِکُ الْاُمَمُ اَنْ تَدَاعٰی عَلَیْکُمْ کَمَا تَدَاعَی الْاَکَلَۃُ اِلٰی قَصْعَتِہَا

"ایک زمانہ آئے گا کہ اقوامِ عالم ایک دوسرے کو تم پر ٹوٹ پڑنے کی اس طرح دعوت دیں گی جیسے (کسی دعوت طعام میں) کھانے والے ایک دوسرے کو دسترخوان کی طرف بلاتے ہیں!"

اس طرح بحیثیت مجموعی امت مسلمہ پر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا دورِ ثانی اس صدی کے ربعِ اول میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا جبکہ پورا عالم اسلام مغربی استعمار کے ناپاک شکنجے میں جکڑا گیا' اگرچہ خاص "امیین" کے حق میں "وَعْدُ الْاٰخِرَۃِ" کی وہ مکمل صورت جو سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷ میں بیان ہوئی تھی تقریباً نصف صدی بعد ۱۹۶۷ء میں ظاہر ہوئی جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی ایک مغضوب و ملعون قوم کے ہاتھوں ایک شرمناک اور ذلت آمیز شکست دلوائی اور عربوں کے عہدِ تولیت کے دوران ایک بار پھر مسجد اقصیٰ کی حرمت پامال ہوئی اور بیت المقدس ان کے ہاتھوں سے نکل کر یہود کے قبضے میں چلا گیا اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس بار یہ قبضہ کتنا طویل ہوگا۔ اس داستان کا المناک ترین باب یہ ہے کہ مغربی استعمار نے امت مسلمہ کی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کردیا اور اس صدی کے آغاز ہی میں نسلی اور علاقائی عصبیتوں کے وہ بیج مسلمان اقوام کے دلوں میں بودیئے جو ابھی تک برگ و بار لا رہے ہیں' چنانچہ پہلے انہوں نے عربوں کو ترکوں کے خلاف ابھارا۔ نتیجۃً عالمِ اسلام کا قلب دولخت ہوگیا اور وحدتِ ملی کی علامت یعنی خلافت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ پھر عالمِ عرب کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں اس طرح تقسیم کیا کہ نسلی اور لسانی اشتراک کے باوجود عالمِ عرب کے کامل اتحاد کا امکان تاحال دور دور تک نظر نہیں آتا۔

اسی نسلی تعصب کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے اس عذاب کا مزہ بھی امت مسلمہ کو چکھنا پڑا جو قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ یَلْبِسَکُمْ شِیَعًا وَّیُذِیْقَ بَعْضَکُمْ بَاْسَ بَعْضٍ "تمہیں گروہوں میں تقسیم کردے اور پھر چکھائے ایک کو دوسرے کی جنگی قوت کا مزہ" (سورۃ الانعام آیت ۶۵) چنانچہ اس صدی کے آغاز میں عربوں کے ہاتھوں ترکوں کا خون بہا اور پھر ۱۹۷۱ء میں بنگالی مسلمان کے ہاتھوں غیر بنگالی مسلمان کے خون کی ہولی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی دھجیاں بکھرنے کا منظر چشمِ فلک نے دیکھا۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ۔

الہدیٰ قسط: ۸۵

مباحث صبر و مصابرت
درس: ۲

اہلِ ایمان کے لیے ابتلاء و امتحان سے گزرنا لازمی ہے!

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں

(۲)

مسلمانوں کے لئے تسلی و تشفی کے کلمات

سورۃ العنکبوت کی دوسری اور تیسری آیت کا مطالعہ اس سے قبل ہم کر چکے ہیں۔ ان دو آیات میں اس گھبراہٹ پر کہ جو بعض مسلمانوں کی طرف سے اللہ کی راہ میں ایذاؤں، تکلیفوں اور مصیبتوں کے ضمن میں ظاہر ہوئی تھی، اللہ کی جانب سے کسی قدر خفگی کا اظہار نمایاں تھا۔ لیکن اب اگلی آیت میں ان کی تسلی، دلجوئی اور تشفی کے ضمن میں ان کفار و مشرکین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو انہیں ستا رہے تھے اور جن کے ہاتھوں انہیں ایذائیں پہنچ رہی تھیں، فرمایا جا رہا ہے کہ کیا ان بدبختوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے؟ ابو جہل نے جو حضرت سمیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو برچھا مار کر شہید کیا اور اس نے حضرت یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو اس طور سے شہید کیا کہ چار مضبوط و توانا سانڈ اونٹ لے کر، ان چاروں سے رسے باندھ کر، ان میں سے ایک رسے سے حضرت یاسرؓ کا ایک بازو، دوسرے سے دوسرا بازو، تیسرے سے آپؓ کی ایک ٹانگ اور چوتھے سے دوسری ٹانگ باندھی گئی اور پھر ان چاروں اونٹوں کو جو دوڑایا گیا تو حضرت یاسرؓ کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ امیہ ابن خلف جو حضرت بلالؓ کو ستا رہا ہے اور حضرت خبابؓ بن ارت کو جو ایذائیں دی جا رہی ہیں یہ آیہ مبارکہ ان کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ فرمایا:

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّسْبِقُوْنَا سَآءَ مَا یَحْکُمُوْنَ ○

"کیا ان لوگوں نے جو ان برائیوں میں مبتلا ہیں (کہ ہمارے چاہنے والوں کو ستا رہے ہیں) یہ گمان کیا ہے کہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے؟ بڑی بری رائے ہے جو وہ قائم کرتے ہیں"۔

اس میں دراصل کفار و مشرکین سے تخاطب نہیں ہے۔ بات ان سے کہنی مقصود ہی نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ مسلمانوں کو سنایا جا رہا ہے اور اس طرح ان کے زخمی دلوں پر گویا ہمدردی کا پھاہا رکھا جا رہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ تمہیں ایذائیں دینے والے یہ مشرکین ہماری گرفت سے بچ نکلیں گے' یہ تو ہماری حکمت کے تحت ہے کہ ہم نے ان مشرکین کی رسی دراز کی ہوئی ہے۔ اس ذریعے سے دراصل تمہاری آزمائش مقصود ہے۔ تمہیں ان آزمائشوں کی بھٹیوں سے گزار کر کندن بنانا ہے۔ اسی لئے ابھی ہم نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ لیکن اگر وہ یہ گمان کرتے ہیں کہ ہماری پکڑ سے بچ نکلیں گے تو وہ بڑے مغالطے میں ہیں۔ تم مطمئن رہو' ان میں سے ہر ایک کو اپنے کئے کی بھرپور سزا مل کر رہے گی۔ اگلی آیت میں مزید تسلی اور دلجوئی کے لئے فرمایا:

مَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ اللّٰہِ فَاِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ لَاٰتٍ

کہ جو کوئی اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہے تو وہ جان لے کہ اللہ کا معین کردہ وہ وقت آ کر رہے گا۔ اشارہ اہل ایمان کی طرف ہے کہ تم یہ سب تکالیف جھیل رہے ہو اللہ سے ملاقات کی امید میں' اس امید میں کہ ایک دن آئے گا کہ اپنے پروردگار سے کہ جو تمہارا مطلوب و مقصود ہے اور جس کی خاطر تم یہ تکالیف اٹھا رہے ہو' تمہاری ملاقات ہو گی۔ ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہارے دل میں یہ وسوسہ پیدا کر دے کہ کیا خبر وہ دن آئے گا بھی کہ نہیں! ---- مطمئن رہو' اللہ کا وہ مقرر کیا ہوا وقت آ کر رہے گا۔ وہ گھڑی اٹل اور شدنی ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ کسی وسوسے کو ذہن کے قریب مت پھٹکنے دو' تمہارا اجر محفوظ ہے۔ اور جان لو "وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ" کہ جس کے لئے تم یہ سب کچھ جھیل رہے ہو وہ کوئی بے خبر ہستی نہیں ہے' وہ معاملہ نہیں ہے کہ مر گئے ہم انہیں خبر نہ ہوئی' وہ سمیع ہے' (سب کچھ سننے والا) اور علیم ہے (سب کچھ جاننے والا)۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس کی نگاہوں میں ہے' بلالؓ کی زبان سے نکلنے والا کلمۂ توحید' اس حال میں کہ

پیاس کی شدت سے زبان باہر نکلی ہوئی ہے' دھوپ کی تمازت کی وجہ سے جان لبوں پر آئی ہوئی ہے' لیکن کلمۂ توحید ہی نکل رہا ہے اَحد' اَحد' کہ میں تو ایک اللہ ہی کا ماننے والا ہوں' اسی کا پرستار ہوں' اس کے سوا کسی اور کو معبود ماننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کی زبان سے نکلنے والا یہ کلمہ اللہ سن رہا ہے۔ **هُوَالسَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ** تمہارے دلوں سے جو صدائیں نکل رہی ہیں ان کا بھی جاننے والا ہے۔ تو پہلی دو آیات میں کسی قدر زجر' جھڑکی اور خفگی کا اظہار تھا اور اس کے بعد دو ہی آیات میں صحابہ کرامؓ کے لئے تسلی' تشفی اور دلجوئی کا انداز اختیار کیا گیا۔

جہاد' اللہ پر احسان نہیں ہے!

اگلی آیت میں سختی کا رنگ پھر جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ کان کھول دینے کے انداز میں فرمایا:

وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ

کہ کوئی جہاد کرتا ہے وہ جان لے کہ وہ اپنے ہی بھلے کو جہاد کرتا ہے۔ یہ خیال ہرگز دل میں نہ آئے کہ وہ اللہ پر کوئی احسان کر رہا ہے' اس جدوجہد اور ایثار و قربانی کا تمام تر فائدہ خود اسی کو پہنچے گا۔ یہاں 'جہاد' کا لفظ خصوصی طور پر توجہ کے لائق ہے۔ اس لئے کہ یہ سورت بالاتفاق مکی ہے اور اس کا زمانہ نزول سن پانچ یا چھ نبوی بنتا ہے۔ ہجرت حبشہ کے موقع پر یہ سورۂ مبارکہ نازل ہوئی' بلکہ ہجرت کی طرف اشارہ اور رہنمائی اسی سورۃ میں موجود ہے۔ لیکن یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جہاد کا ذکر نہایت اہتمام کے ساتھ آیا ہے: **وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ** حالانکہ قتال فی سبیل اللہ کا مرحلہ تو ابھی آٹھ نو برس کے بعد آنے والا تھا۔ یہ کشمکش اور یہ جدوجہد اس وقت PASSIVE.RESISTANCE (صبرِ محض) کے دور میں تھی۔ مسلمانوں کو حکم تھا کہ ڈٹے رہو' قائم رہو' ماریں کھاؤ لیکن مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے باوجود اس صورت حال کو جہاد کا نام دیا گیا۔ یہ جدوجہد اور یہ STRUGGLE ہے اپنے مسلک اور اپنے ایمان کے لئے' اپنے عقائد اور اپنے نظریات کے لئے۔ ثابت کر دو کہ تم ثابت قدم ہو اور اس کے لئے ہر شے کو قربان کر سکتے ہو' ہر بازی کھیل سکتے ہو لیکن کبھی بھولے سے بھی دل میں یہ خیال نہ آئے کہ تم اللہ پر' اس کے دین پر یا اس کے نبی ﷺ پر کوئی احسان کر رہے ہو۔

اللہ تو بے نیاز ہے' اللہ کو کوئی احتیاج نہیں' وہ غنی ہے تمام جہانوں سے۔

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ تمہارے اس جہاد و مجاہدہ' صبر و مصابرت اور ایثار و قربانی کا سارا نفع تمہی کو پہنچنے والا ہے " **وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ**" چنانچہ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ تمہاری سیرت پختہ ہوگی' تمہارا کردار کندن بنے گا بلکہ تمہارے ایمان و عمل کو جلا حاصل ہو گی' آخرت میں تمہیں اس کی بدولت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سایہ اور جنت کی نعمتیں نصیب ہوں گی۔ لہٰذا اللہ کی راہ میں جہاد و مجاہدہ اس خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کرو کہ یہ میں اپنا کام کر رہا ہوں' اللہ پر اور اس کے نبی ﷺ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ یہ مضمون یہاں بڑے تیکھے انداز میں آیا ہے: **وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ** کہ جو کوئی جہاد کرتا ہے' دین کی راہ میں سرفروشی کا مظاہرہ کرتا ہے' وہ اپنے ہی فائدے کے لئے یہ سب کچھ کرتا ہے' اللہ کو کسی کی کوئی احتیاج نہیں ہے' وہ تمام جہانوں سے غنی اور بے نیاز ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا رخ اس سے قبل سورۃ الحجرات میں ہمارے زیر مطالعہ آیا تھا:

يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ○

" (اے نبی) یہ آپ پر احسان دھر رہے ہیں اپنے اسلام کا' فرما دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا کوئی احسان نہ دھرو۔ بلکہ اللہ تم پر احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی راہ سجھائی اگر تم سچے ہو!"

منّت منہ کہ خدمتِ سلطاں ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

کہ بادشاہ کی خدمت کا تمہیں اگر کوئی موقع ملا ہے تو یہ نہ سمجھ کہ اس پر تمہارا کوئی احسان ہے بلکہ بادشاہ کا احسان مانو کہ اس نے تمہیں اپنی خدمت کا موقعہ دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جسے بھی اللہ نے اپنے دین کی خدمت کی توفیق دی ہے اسے اللہ کا احسان مند ہونا چاہئے کہ اس نے اسے اپنی خدمت کے لئے قبول فرمالیا ہے۔

اطمینانِ قلب کے لئے ایک عظیم بشارت

اگلی آیت میں ایک بار پھر ہمت بندھانے کا انداز ہے۔ چنانچہ اہل ایمان کی تسلی'

تشفی اور قلبی اطمینان کے لئے فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ○

کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ان سے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ہم لازماً ان سے ان کی برائیوں کو دور کر دیں گے اور ہم لازماً ان کے اعمال کا بہترین بدلہ انہیں عطا کریں گے۔ نوٹ فرما لیجئے کہ یہاں ایمان کے ساتھ "**عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ**" اسی طرح جڑا ہوا آ رہا ہے جیسے کہ ہمارے پہلے سبق یعنی سورۃ العصر میں تھا: "**وَالْعَصْرِ○ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ○ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ**" ——— اگر ایمان ہے اور عمل صالح نہیں ہے بلکہ ایمان کا بھی صرف اقرار باللسان والا پہلو ہو یعنی صرف قانونی ایمان موجود ہو تو اس کا فائدہ بس اتنا ہی ہو گا کہ دنیا میں مسلمان سمجھ لئے جاؤ گے لیکن اللہ کے ہاں کسی کا واقعتاً مومن قرار پانا کچھ اور شرائط کے ساتھ مشروط ہے۔ ہاں وہ ایمان اگر یقین بن کر دل میں جاگزیں ہو گیا ہو اور اس کے عملی تقاضے انسان پورے کر رہا ہو تب اللہ کا پختہ وعدہ ہے کہ: "**لَنُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَنَجْزِیَنَّھُمْ اَحْسَنَ الَّذِیْ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ**" انتہائی تاکیدی انداز ہے۔ ایسے لوگوں سے ان کی برائیوں کو لازماً دور کر دیں گے اور ان کی محنت و کاوش کا بھرپور صلہ انہیں عطا فرمائیں گے۔

یہ مضمون تقریباً انہی الفاظ میں سورۂ آل عمران کے آخری رکوع کی آیات میں بھی آ چکا ہے:

فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ

"پس وہ لوگ جنہوں نے ہجرت کی اور وہ اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے اور انہیں میری راہ میں تکالیف پہنچائی گئیں اور انہوں نے قتال کیا اور جان قربان کر دی' میں لازماً دور کر دوں گا ان سے ان کی برائیوں کو۔ (ان کے نامہ اعمال کے دھبے بھی دھو دوں گا اور ان کے دامن کردار کے داغ بھی صاف کر دوں گا) اور میں انہیں لازماً داخل کروں گا ان باغات میں جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی"۔

نوجوانوں کا خصوصی معاملہ

مکہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والوں پر جو بدترین تشدد ہو رہا تھا اس کا اولین نشانہ تو وہ لوگ بنے جو غلاموں کے طبقے سے ایمان لائے تھے لیکن اس تشدد کا دوسرا بڑا شکار نوجوان تھے۔ یہ بات یہاں سمجھ لینی چاہئے کہ ہر دور میں کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرنے والوں میں معاشرے کے یہی دو طبقے آگے بڑھے ہیں۔ یا تو معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کسی انقلابی دعوت کو لپک کر قبول کرتے ہیں اور یا پھر نوجوان اس میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ اسلام کی دعوت اپنی اصل کے اعتبار سے' اپنی نوعیت کے اعتبار سے انقلابی دعوت ہے۔ اسلام کی دعوت' عام مذہبی معنی میں تبلیغ کا عمل نہیں ہے۔ یہ بدھ مت کے بھکشوؤں یا عیسائی مشنریوں کی طرح کی تبلیغ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس کی پشت پر ایک مضبوط نظریہ ہے۔ اس نظریئے کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کرنا ہے' نظام تبدیل کرنا ہے' اللہ کے دین کو سربلند کرنا ہے' اس کی کبریائی کو نافذ و قائم کرنا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ایک نہایت گھمبیر انقلابی جدوجہد ہمیں نبی اکرم ﷺ کی اس تئیس سالہ جدوجہد میں نظر آتی ہے جس کا آغاز پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہوا اور جو آپ کے وصال تک جاری رہی۔ انقلابی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ لیجئے کہ اگرچہ اس کا رخ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کی طرف ہوتا ہے اور وہ پس ماندہ طبقات کو اپنا اولین ہدف نہیں بنایا کرتی' جیسے کہ عیسائی مبشرین یا مبلغین کا عام انداز ہوتا ہے کہ پسے ہوئے اور دبے ہوئے طبقات کی دلجوئی کر کے اور کچھ ان کی خدمت کر کے' مثلاً کچھ دودھ کے ڈبے تقسیم کر کے یا ان کے علاج معالجے کا بندوبست کر کے ان کے دلوں میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ پیدا کر لیا جائے' تاہم اس انقلابی دعوت کی طرف سب سے پہلے یہی طبقات پیش قدمی کرتے ہیں۔

انقلابی دعوت ہمیشہ ایک فکر' ایک نظریہ پیش کرتی ہے اور اسے اس کی FACE VALUE پر قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ چنانچہ انبیاء اور رسولوں کی دعوت کا انداز ہمیشہ یہ رہا کہ وہ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کو سب سے پہلے مخاطب کرتے تھے۔ حضرت موسیٰؑ کو بھیجا گیا تو حکم ہوا: "اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى"۔ جاؤ فرعون کے پاس وہ بہت سرکشی دکھاتا ہے گویا پہلا تبلیغی مشن جو انہیں سونپا گیا وہ فرعون کے دربار میں

دعوت پیش کرنے کے حکم پر مشتمل تھا۔ حضور ﷺ کو ام القریٰ میں یعنی مکہ میں کہ جو بستیوں کا مرکز تھا' مبعوث کیا گیا۔ مکہ پورے عرب کے لئے تہذیبی' مذہبی اور ثقافتی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ سیاسی صدر مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپؐ جب مکے سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے تو وہاں آپؐ نے گلیوں میں کھڑے ہو کر اسلام کی صدا نہیں لگائی' دعوت و تبلیغ کے لئے پس ماندہ طبقات کو منتخب نہیں کیا بلکہ آپؐ نے طائف کے تین چوٹی کے سرداروں سے ملاقات کی اور اسلام کی دعوت ان کے سامنے رکھی! یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دعوت اسلامی کا مزاج عام مذہبی تبلیغ سے بالکل جدا ہے' لیکن اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات ہوتے ہیں ان کے VESTED INTEREST ہوتے ہیں' پہلے سے موجود نظام کے ساتھ ان کے بھاری مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ مصلحتوں کی بڑی بھاری بیڑیاں ان کے پاؤں میں پڑی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے کسی انقلابی دعوت کو قبول کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تاہم ان میں بعض اوقات کچھ ایسے انتہائی سلیم الفطرت لوگ بھی ہوتے ہیں جو فوراً اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن عام طور پر جو لوگ اس دعوت کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں ان میں ایک تو وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اس معاشرے میں ویسے ہی دبے ہوئے اور پسے ہوئے ہوتے ہیں' جن کے کوئی مفادات اس نظام کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے کہ جو ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن سکیں یا ان کی آنکھوں کے آگے پردہ بن کر حائل ہو سکیں' وہ اس دعوت کو FACE VALUE پر آگے بڑھ کر قبول کرتے ہیں' (اس طبقے میں سے حضرت بلالؓ اور حضرت خبابؓ بن الارت کا ذکر ہو چکا ہے)

دوسرا طبقہ جو کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے وہ نوجوانوں کا طبقہ ہوتا ہے' اس لئے کہ یہ عمر ولولوں اور امنگوں کی عمر ہوتی ہے۔ ابھی کوئی مصلحت کوئی اور مصلحت بینی ان پر مسلط نہیں ہوئی ہوتی۔ ان کے جسم و جان میں کردار کی حرارت موجود ہوتی ہے' ابھی ان کا ضمیر مفادات کے مقابلے میں اتنا شکست خوردہ نہیں ہوتا کہ کسی بات کو حق سمجھنے کے باوجود اسے رد کر دے۔ چنانچہ نوجوان ہی کسی انقلابی دعوت کا ہراول دستہ بنتے ہیں۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ حضور ﷺ پر بھی ایمان لانے میں قریش کے سربرآوردہ اور شرفاء کے خاندانوں میں سے نوجوانوں ہی نے پیش

فدی کی۔ حضرت سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ایمان لائے تو ابھی نو عمر یعنی TEENAGER تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب ایمان قبول کیا تو وہ بھی عمر کے اسی دور سے گزر رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نوعمری میں اللہ نے جو امتیاز بخشا اس سے کون واقف نہیں! بلکہ ان کے بارے میں یوں کہئے کہ وہ تو پہلے ہی اپنے تھے، گھر کے فرد تھے۔ اسی طرح نوجوانوں میں سے کئی ایسے تھے جو ایمان لائے۔ ان نوجوانوں پر بھی تشدد ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بنو امیہ کے بڑے اعلیٰ گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اگرچہ اتنے کم عمر نہیں تھے کہ انہیں TEENAGER قرار دیا جا سکے، لیکن ایمان لانے پر چچا نے یہ معاملہ کیا کہ ایک چٹائی میں لپیٹ کر انہیں دھواں دے دیا کہ دم گھٹ جائے۔ ان نوجوانوں کو اس جسمانی ایذا اور تشدد پر مستزاد جو مسئلہ درپیش ہوا وہ یہ کہ ان کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کر ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اس نئے دین کو چھوڑو اور آبائی دین پر واپس آ جاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ نوجوانوں کے طبقے (teenagers) میں سے جن لوگوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہا ان کے بارے میں بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ انتہائی سلیم الطبع اور سلیم الفطرت نوجوان ہوں گے۔ ان کی سلامتی طبع اور سلامتی فطرت ہی کا یہ بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے والدین کا ادب و احترام ملحوظ رکھیں اور ان کے حقوق ادا کریں۔ لہٰذا ان کے لئے یہ ایک نہایت پریشان کن مرحلہ تھا کہ وہ والدین کی اطاعت کریں اور ان کا کہا مانیں یا توحید کو اختیار کریں اور والدین کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ادھر ان کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کر انہیں راہ حق سے برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا واقعہ

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب معاملہ حضرت سعدؓ بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت سعدؓ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور انہی کے ہاتھوں بعد میں ایران فتح ہوا۔ یہ جب ایمان لائے تو ابھی نوعمر نوجوان تھے۔ والد فوت ہو چکے تھے، ماں نے بڑی محبت سے پالا اور بڑی محنت سے ان کی تربیت کی تھی۔ ماں اگر انتہائی محبت کرنے والی تھی تو بیٹا بھی سعادت مندی میں کم نہ تھا۔ ان کے سعادت مند اور سلیم الطبع ہونے

کا ایک منظر یہ بھی سامنے آیا کہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے۔ مشرک ماں نے اب اپنا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈالا اور بیٹے پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ اگر سعدؓ اپنے آبائی دین میں واپس نہ آیا تو نہ کچھ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی' اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گی۔ گویا آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے کہ اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ آپ غور کیجئے کہ کیسی شدید ذہنی اذیت اور سخت آزمائش سے حضرت سعدؓ اس وقت دو چار ہوئے ہوں گے۔ یہ ہے پس منظر جس میں یہ موضوع یہاں زیر بحث آ رہا ہے۔

مسئلے کا حل

فرمایا: "وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا" کہ اے نوجوانو' تمہاری فطرت کا یہ اقتضاء غلط نہیں ہے کہ والدین کا ادب و لحاظ ہونا چاہئے' یہ چیز ہم نے خود فطرت انسانی میں ودیعت کی ہے۔ ہم ہی نے تاکید کی ہے انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے' ان کا ادب و احترام کرے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ یہ مضمون اس منتخب نصاب میں اس سے قبل سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں آ چکا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید میں مضامین کا تکرار واعادہ کے ساتھ آنا بغیر کسی حکمت کے نہیں ہوتا۔ وہاں سورۂ لقمان میں حقوق کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی کہ انسان پر سب سے پہلا اور سب مقدم حق اللہ کا ہے۔(يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ) اس کے بعد والدین کا نمبر آتا ہے۔ گویا اللہ کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اپنے والدین کا ہے۔ تو وہاں یہ بحث اس حوالے سے آئی تھی کہ اگر کسی معاملے میں اللہ کا حق اور والدین کے حقوق ٹکرانے لگیں تو صحیح قابل عمل صورت کیا ہو گی! ---- یہاں سورۃ العنکبوت میں معاملہ زیر بحث ہے کہ ایمان لانے والوں کو کن کن مسائل اور کون کون سے مخمصوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے چونکہ بالخصوص یہ مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ ان کے والدین انہیں شرک کرنے پر مجبور کرتے تھے لہٰذا اس مضمون کا یہاں پھر اعادہ کر دیا گیا۔ فرمایا:

"وَإِنْ جَاهَدَاكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا"

یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے لیکن ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے۔ ہر صاحب حق پر کوئی اور صاحب حق موجود ہے' اور تمام حقوق میں فائق ترین حق اللہ کا ہے۔ والدین کا حق مسلم' لیکن "اگر وہ تم سے جھگڑیں (اور مجبور کریں) اس بات پر کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک ٹھہراؤ جس کے بارے میں تمہیں کوئی علم حاصل نہیں' تو ان دونوں کا کہا مت مانو!"

یہاں نوٹ کیجئے کہ لفظ جہاد مشرک والدین کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ ان کی یہ کوشش یعنی شرک کے حق میں اپنا دباؤ استعمال کرنا' یہ سب ان کا مجاہدہ ہے اور اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجاہدہ فی سبیل الشرک ہے' یا یوں کہئے کہ فی سبیل الطاغوت یا فی سبیل الشیطٰن ہے! --- تو اگر تمہارے والدین تمہیں شرک پر مجبور کر رہے ہیں تو درحقیقت وہ اپنے حقوق سے تجاوز کر رہے ہیں' لہٰذا ان کا کہنا مت مانو! ... مزید فرمایا:

"اِلَیَّ مَرْجِعُکُمْ فَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ○"

"میری ہی طرف تم سب کو لوٹنا ہے اور پھر میں تمہیں جتلا دوں گا (کھول کھول کر سامنے رکھ دوں گا) جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔"

معلوم ہوا کہ ایک تو اس طرح اس نہایت اہم مسئلے کا حل اللہ تعالیٰ نے پیش فرما دیا جو اہل ایمان میں سے نوجوان طبقہ کو درپیش تھا۔ اور اس طرح ان کی ذہنی الجھن دور ہوئی۔

اہل ایمان کے لئے ایک نوید

اگلی آیت میں اہل ایمان کے لئے پھر REASSURANCE ہے یعنی تسلی و تشفی کا انداز اور اچھے انجام کی نوید ہے۔ یہاں ہمیں اس معاملے پر بھی خاص طور پر غور کرنا ہو گا کہ یہ اعادہ کیوں ہو رہا ہے' حالانکہ دو آیات قبل اس سے ملتا جلتا مضمون گزر چکا ہے۔ فرمایا:

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّھُمْ فِی الصّٰلِحِیْنَ○

"اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہم انہیں لازماً نیکو کاروں میں داخل کریں گے"۔

دیکھئے' ایمان کے ساتھ اس کے عملی تقاضے یعنی عمل صالح کا ذکر ایک بار پھر اہتمام

کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس سیاق کلام اور جس CONTEXT (پس منظر) میں گفتگو ہو رہی ہے' اس میں 'عمل صالح' سے کون سے اعمال مراد ہیں؟ ابھی نماز تو فرض نہیں ہوئی' روزے کا کوئی حکم ابھی آیا ہی نہیں' زکوۃ کا ابھی کوئی نظام سرے سے قائم نہیں ہوا' تو یہاں 'عمل صالح' سے آخر کون سا عمل مراد ہے !!! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان کا جو بھی عملی تقاضا سامنے آئے اسے پورا کرنا' ایمان پر ثابت قدمی دکھانا' رسول کے حکم کی اطاعت کرنا کہ رسولؐ اگر یہ کہیں کہ خواہ تمہیں اذیت دے کر ہلاک کر دیا جائے تم مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے' جماعتی ڈسپلن کی پابندی کرنا اور دین کی دعوت و تبلیغ میں نبی کے دست و بازو بننا' یہ سب چیزیں عمل صالح میں شامل ہیں۔ گویا ایک لفظ میں اگر ہم یوں کہیں کہ یہاں 'عمل صالح' سے مراد ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی' ہے تو یہ درست ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں عمل صالح کا جو نقشہ بنا ہوا ہے اس کا ابتدائی مکی دور میں وجود نہیں تھا! اس آیت میں "لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصّٰلِحِيْنَ" کے الفاظ بھی خصوصی طور پر لائق توجہ ہیں۔ "ہم لازماً انہیں صالحین میں داخل کریں گے"۔ وہی تاکیدی انداز جو آیت نمبر ۷ میں اختیار فرمایا گیا' یہاں بھی موجود ہے۔ اس آیت کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا ہے:

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَحْسَنَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

غور طلب بات یہ ہے کہ دو بار اس مضمون کا اعادہ کیوں ہوا۔ ذرا غور کریں گے تو بات واضح ہو جائے گی اور اس تکرار میں جو معنوی حسن ہے وہ سامنے آجائے گا۔ دیکھئے' یہاں ان نوجوانوں کا معاملہ زیر بحث تھا جو اسلام لانے کی پاداش میں اپنے والدین سے کٹ رہے تھے' جنھیں اپنے رشتے داروں سے تعلق کاٹنا پڑ رہا تھا۔ یہاں ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے کہ تم صرف کٹے ہی نہیں ہو' کسی سے جڑے بھی ہو! ------ تمہیں اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ اب تمہارا تعلق قائم ہوا ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے ساتھ! تم ان صالحین اور نیکو کاروں کے ساتھ ایمانی رشتے میں منسلک ہو گئے ہو۔ چنانچہ وہ صدمہ جو ایک سلیم الطبع انسان محسوس کرتا ہے کہ میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے کٹ گیا ہوں' اس کا ازالہ اس آیت سے ہو جاتا ہے۔

حزب اللہ
(یعنی اسلامی انقلابی جماعت)
کی مسنون تنظیمی اساس

ڈاکٹر اسرار احمد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اب سے چودہ سو سال قبل "حزب اللہ" کی تنظیمی اساس جس "بیعت سمع و طاعت" پر استوار فرمائی تھی اس کا محل وقوع ظرفِ مکان اور ظرفِ زمان دونوں کے اعتبار سے اہمیت کا حامل بھی ہے اور دلچسپی کا موجب بھی!

یہ بیعت آنحضورؐ نے نبوت کے تیرہویں سال حج کے موقع پر یثرب (جو ہجرت کے بعد پہلے "مدینۃ النبیؐ" قرار پایا اور بعد ازاں مدینہ منورہ کے نام سے موسوم ہوا) سے آئے ہوئے بہتر (۷۲) مسلمانوں سے لی تھی۔ اور اسے تاریخ اور سیرت میں "بیعتِ عقبۂ ثانیہ" کا عنوان دیا گیا ہے۔

یہ عقبہ ایک تنگ گھاٹی تھی' (عقبہ عربی زبان میں کہتے ہی اونچی اور تنگ گھاٹی کو ہیں) جو وادیٔ منیٰ کے اس کنارے سے جو مکہ مکرمہ سے متصل ہے کسی قدر مشرق کی طرف' وادیٔ منیٰ کے شمال مغربی جانب واقع تھی۔ اب تو وادیٔ منیٰ کے لئے پہاڑوں کو کاٹ کر نہایت کشادہ اور سیدھا راستہ مکہ سے آنے والوں کے لئے بنادیا گیا ہے' لیکن اس سے قبل وادیٔ منیٰ میں داخلہ کے لئے لازمی طور پر اسی اونچی اور تنگ گھاٹی میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ ماضی کا صیغہ میں بار بار اس لئے استعمال کر رہا ہوں کہ چند سال قبل جو عظیم الجثہ پہاڑ اسے وادیٔ منیٰ سے جدا کرتا تھا اسے بھی

کاٹ کر سپاٹ کر دیا گیا ہے اور اب یہ گھاٹی وادیٔ منیٰ کا حصہ بن چکی ہے!

اب سے اٹھارہ سال قبل (۱۹۷۴ء میں) جب حج بیت اللہ کے لئے تیسری بار حاضری ہوئی تو اس سے متصلاً قبل سیرت سید احمد شہیدؒ میں اس گھاٹی کا ذکر تفصیل سے پڑھنے میں آیا تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے بھی آنحضورؐ کے اتباع میں اپنے رفقاء سے اسی مقام پر بیعت لی تھی ---- چنانچہ میں نے بعض مقامی عربوں (معلموں وغیرہ) سے بھی اس کے محل وقوع کے بارے میں دریافت کیا اور ایسے پاکستانی حضرات سے بھی جو طویل عرصہ سے وہیں مقیم تھے' لیکن کوئی بھی اس کی نشاندہی نہیں کر سکا' بلکہ معلوم ہوا کہ اکثر لوگوں نے کبھی اس کا ذکر تک نہیں سنا تھا! لیکن میرے دل میں جو تجسس تھا اس نے مجھے منیٰ کے مشرقی حصے میں وادی کے دونوں جانب کے پہاڑوں اور وادیوں میں کسی قدر بادیہ پیمائی کے بعد بالآخر اس مقام تک پہنچادیا۔ چنانچہ اچانک ایک جگہ ایک بوسیدہ سی ویران مسجد نظر آئی جس پر خطِ کوفی میں کتبہ بھی لگا ہوا تھا جو امتدادِ زمانہ کے باعث پورا تو پڑھنے میں نہ آسکا لیکن اس سے اس قدر معلوم ہو گیا کہ "جا ایں جا است!" کے مصداق یہی وہ مقام ہے جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ یثرب سے مسلسل تین سال حج کے ایام میں وہ ملاقاتیں اور گفتگوئیں فرمائیں جن سے ہجرتِ مدینہ کی راہ ہموار ہوئی اور انسانی تاریخ کے دھارے کا رخ بدل کر رہ گیا!

میں اپنے دو ساتھیوں جناب قمر سعید قریشی اور ڈاکٹر خواجہ نسیم الدین کو بھی وہاں لے گیا۔ مسجد نہایت بوسیدہ حالت میں تھی' صدر دروازہ مقفل تھا' اندر کتوں نے ڈیرے لگائے ہوئے تھے۔ ہم بمشکل دیوار پھاند کر اندر گئے۔ کچھ جگہ صاف کی اور وہاں نوافل ادا کئے ----- (یہاں اس امر کا ذکر محض بر سبیلِ تذکرہ ہے کہ اس مسجد کے ساتھ یہ سلوک علمائے نجد کے اس سخت موقف کے باعث ہے کہ وہ تاریخی یادگاروں کو محفوظ رکھنے کو بھی بدعت خیال کرتے ہیں) -------- یہ مسجد ترکوں نے اپنے دورِ خلافت میں بنوائی تھی جو ۹۱ء کے حج تک تو اپنی اس زبوں حالی

کے ساتھ، بلکہ اس کی شدت میں اضافے کے ساتھ موجود تھی۔ اب تک ہو سکتا ہے کہ جن بلڈوزروں نے اس پہاڑ کا نام و نشان مٹادیا تھا جو اس گھاٹی کو وادیٔ منیٰ سے جدا کرتا تھا وہ اس مسجد پر بھی چل چکے ہوں!

اب آیئے ظرفِ زمان کی جانب۔ سن دس (۱۰) نبویؐ آنحضورؐ کی حیات طیبہ کا مصائب اور مشکلات کی شدت کے اعتبار سے سخت ترین سال تھا۔ اسی بناء پر آپؐ نے اسے "عام الحزن" یعنی رنج و غم کا سال قرار دیا۔ آپؐ کی دس سالہ دعوت و تبلیغ اور شدید محنت و مشقت کے نتیجے میں اس وقت تک لگ بھگ صرف سوا سو، یا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ سو اشخاص ایمان لائے تھے اور پورا مکہ بحیثیتِ مجموعی آپؐ کی جان کا دشمن تھا۔ اس ضمن میں مشرکینِ مکہ کی راہ میں حائل صرف ابوطالب کی شخصیت تھی جو بنو ہاشم کے سردار ہونے کے ناطے اہمیت کے حامل تھے اور مسلسل دس سال سے آنحضورؐ کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ اس سال ان کا انتقال ہوگیا تو مکہ کی قبائلی پارلیمنٹ "دارالندوہ" میں آنحضورؐ کے قتل کا ریزولیوشن منظور ہوگیا۔ اس پر آپؐ نے اپنی دعوت و تحریک کے لئے کسی متبادل قاعدے (Base) کی تلاش میں طائف کا سفر کیا لیکن وہاں جو توہین آمیز اور جلی کٹی باتیں آپؐ کو سننی پڑیں، بلکہ جو جسمانی تشدد جھیلنا پڑا، وہ مکہ میں دس سال میں بھی نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا وہاں سے واپسی ہوئی اور وہ بھی اس حال میں کہ اب مکہ میں داخلہ ایک سردار مطعم بن عدی کی امان حاصل کرکے ہی ہوسکا۔ (یہ شریف اور بامروت انسان، افسوس ہے کہ، حالتِ کفر ہی میں انتقال کر گیا۔ لیکن آنحضورؐ کو اس کے احسان کا اس درجہ پاس تھا کہ بعد میں جنگِ بدر کے اسیروں کے ضمن میں آپؐ نے فرمایا تھا کہ اگر آج مطعم زندہ ہوتا اور وہ سفارش کرتا تو میں ان تمام قیدیوں کو بغیر کسی فدیہ کے رہا کردیتا!)

اس مایوسی کے عالم میں نبوت کے گیارہویں سال (جولائی ۶۲۰ء میں) حج کے موقع پر اس تنگ گھاٹی میں آنحضورؐ کی ملاقات چھ اشخاص سے ہوئی جن کا تعلق یثرب کے قبیلہ خزرج سے تھا۔ اور بحمداللہ وہ اسلام لے آئے اور اس طرح یثرب کی

طرف ایک کھڑکی کھل گئی جس سے امید کی ہوا کا ٹھنڈا جھونکا آیا۔ اور اللہ کی وہ شان ظاہر ہوئی جس کا ذکر سورۃ الطلاق میں ہے کہ "وہ ایسے راستوں سے عطا فرماتا ہے جس کا انسان کو گمان تک نہیں ہوتا" (آیت نمبر۳)۔ اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال یثرب سے بارہ افراد کا قافلہ آیا جس میں سے پانچ تو وہی تھے جو پہلے سال ایمان لاچکے تھے اور سات نئے تھے۔ ان بارہ حضرات سے آنحضورؐ نے ایک بیعت لی جو تاریخ و سیرت میں "بیعت عقبۂ اولیٰ" کے نام سے موسوم ہے۔ اس بیعت کے الفاظ بالکل وہی تھے جو بعد میں خواتین کی بیعت کے سلسلے میں ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہوئے ------ اور صحیح بخاری میں بھی حضرت عبادہ ابنِ صامت رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

اَنَّ رسولَ اللّٰہِ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قالَ وَحولَہٗ عِصابَۃٌ مِّن اَصحابِہٖ بَایِعونِی عَلٰی اَنْ لَا تُشرِکُوا بِاللّٰہِ شَیئًا وَلَا تَسرِقُوا وَلَا تَزنُوا وَلَا تَقتُلُوا اَولَادَکُم وَلَا تَاتُوا بِبُھتَانٍ تَفتَرُونَہٗ بَینَ اَیدِیکُم وَاَرجُلِکُم وَلَا تَعصُوا فِی مَعرُوفٍ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' جبکہ آپؐ کے صحابہؓ کی ایک جماعت بھی آپ کے پاس ہی موجود تھی: آؤ مجھ سے اس بات پر بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو گے' چوری نہ کرو گے' زنا نہ کروگے' اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گے' اپنے ہاتھ پاؤں کے مابین سے گھڑ کر کوئی بہتان نہیں لگاؤ گے (مراد ہے جنسی بہتان طرازی) اور کسی بھلی بات میں میری نافرمانی نہ کرو گے!" ------

ظاہر ہے کہ یہ زیادہ تر اخلاقی اصلاح کی بیعت ہے جس میں کسی جماعتی نظم کا کوئی اشارہ موجود نہیں ہے۔ چنانچہ بعد میں صوفیاءِ کرام کے حلقوں میں جو بیعتِ سلوک و ارشاد کا سلسلہ شروع ہوا اس کی بنیاد یہی بیعت عقبۂ اولیٰ ہے!)

ان بارہ حضرات کے ساتھ ان کی اس درخواست پر کہ "اب آپؐ سے تو ملاقات ایک سال بعد یعنی ایامِ حج ہی میں ہوسکے گی' اس عرصے کے لئے آپ ہمارے ساتھ اپنے کسی معتمد شاگرد کو بھیج دیجئے جو ہمیں قرآن کی تعلیم دے اور یثرب میں

اسلام کی تبلیغ کرے" آپؐ نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ کردیا جو یثرب میں "المقری" یعنی قرآن پڑھانے والا' کے نام سے مشہور ہوگئے اور جن کی محنت کے نتیجے میں آئندہ سال ان کے ہمراہ ۷۲ مردوں اور تین خواتین پر مشتمل مسلمانوں کا قافلہ آپؐ کی خدمت میں پھر اسی وادیٔ عقبہ میں حاضر ہوا۔ اور اب اس موقع پر (جون ۶۲۲ء میں) آپؐ نے ان سے وہ تاریخ ساز بیعت لی جو "بیعت عقبۂ ثانیہ" کے نام سے موسوم ہے اور جس نے اولاً ہجرتِ مدینہ اور بالآخر جزیرہ نمائے عرب میں انقلابِ اسلامی کی تکمیل یعنی غلبۂ دین کی راہ ہموار کی ----!

اب آیئے اس بیعت کے الفاظ کی جانب۔ اس کے راوی بھی وہی انصاری صحابی یعنی حضرت عبادہ ابنِ صامتؓ ہیں جنہوں نے بیعت عقبۂ اولیٰ کے وہ الفاظ روایت کئے ہیں جن کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ یہ ان چند انتہائی خوش قسمت صحابہ میں سے ہیں جنہوں نے عقبہ کی دونوں بیعتوں میں شرکت کی سعادت حاصل کی۔ ان کی مندرجہ ذیل روایت متفق علیہ ہے' یعنی صحیح مسلمؒ میں بھی ہے اور صحیح بخاریؒ میں بھی' اور یہ واضح رہنا چاہئے کہ سند کے اعتبار سے ایسی حدیثوں سے بڑھ کر رتبہ کسی اور حدیث کا نہیں ہوتا! وہ فرماتے ہیں:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ علیہ وسلم عَلَی السَّمْعِ وَ الطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَ الْیُسْرِ وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا وَ عَلٰی اَلَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ

"ہم نے بیعت کی تھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر کہ ہم آپؐ کا ہر حکم سنیں گے' اور اطاعت کریں گے' خواہ ہم تنگی میں ہوں' خواہ آسانی میں اور خواہ ہماری طبیعتوں میں انشراح اور آمادگی ہو' خواہ ہمیں اپنے اوپر جبر کرنا پڑے' اور خواہ ہم پر (عہدوں وغیرہ کے ضمن میں) دوسروں کو ترجیح دے دی جائے' (مزید برآں ہم نے یہ بیعت بھی کی کہ) ہم اختیار اور فیصلوں کے بارے میں اس کے ذمہ دار لوگوں کے ساتھ جھگڑا نہیں کریں گے۔ (اور اس کی بھی بیعت کی کہ) ہر حال میں حق بات ضرور کہیں گے اور اس معاملے

میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے!" -----

یہ روایت صحیح مسلمؒ میں جن الفاظ میں وارد ہوئی ہے ان میں متذکرہ بالا الفاظ تو جوں کے توں ہیں' البتہ ذمہ دار حضرات سے اختلاف کے ضمن میں ان الفاظ کا اضافہ ہے کہ:

اِلَّآ اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا' عِنْدَکُمْ فِیْہِ مِنَ اللّٰہِ بُرْھَانٌ

"اِلا یہ کہ تم (ذمہ دار عہدیداروں کی جانب سے) کسی ایسے صریح کفر کا مشاہدہ کرو جس کے (کفر یا معصیت ہونے کے) لئے تمہارے پاس اللہ کی جانب سے واضح دلیل موجود ہو!" -----

اور ان میں ضمیروں کا جو فرق واقع ہوا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صحابہؓ سے بیعت کے الفاظ ادا کراتے ہوئے یہ الفاظ خود آنحضورؐ کی جانب سے اضافے کے طور پر وارد ہوئے ہیں!

اس بیعت کے سلسلے میں چند اور تاریخی حقائق پیشِ نظر رہیں تو یہ حقیقت بالکل واضح اور مبرہن ہو جاتی ہے کہ یہ دراصل "حزب اللہ" کی ہیئت تنظیمی کی اساس اور جماعتی نظام کے قیام کی بنیاد تھی:

۱۔ اس سے قبل پورے بارہ سال کے دوران نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیعت اہلِ مکہ میں سے کسی سے نہیں لی۔ اس سے قبل صرف "بیعتِ اسلام" کا ذکر ملتا ہے اور وہ بھی اہلِ مکہ میں سے کسی سے نہیں بلکہ صرف ان لوگوں سے جو مکہ سے باہر سے آئے ہوئے ہوتے تھے اور اسلام کی سعادت سے مشرف ہو جاتے تھے۔ اس سے بحمد اللہ وہ بات مزید موکد ہو گئی جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ آنحضورؐ پر ایمان لے آنا ہی "بیعت سمع و طاعت" کے مترادف تھا' اس لئے کہ جب کسی نے آپؐ کو اللہ کا رسولؐ تسلیم کر لیا تو پھر آپؐ کے حکم سے سرتابی چہ معنی دارد؟ ----- لہٰذا محض آپؐ کی اطاعت کے اقرار کے لئے کسی اضافی قول و قرار کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔

۲۔ اب تک مسلمانوں کی پوری جمعیت یا جماعت مکہ مکرمہ ہی میں تھی (سوائے

چند اکابر کا حضرات کے جو مختلف علاقوں اور قبائل میں منتشر تھے) اور مکہ میں آپؐ بنفسِ نفیس ہمہ وقت موجود تھے اور ہر صحابیؓ کا آپؐ کے ساتھ براہِ راست رابطہ قائم تھا۔ لہٰذا کسی درمیانی رابطے کی کوئی ضرورت نہیں تھی ---- یہی وجہ ہے کہ وہاں نہ کسی کو نقیب بنانے کا ثبوت ملتا ہے نہ ماتحت امیر! ---- اس کے برعکس اہلِ یثرب طویل مسافت پر تھے، ---- اور اب ان کی تعداد بھی خاصی معتدبہ تھی، لہٰذا درمیانی نقباء اور امراء کی حاجت فطری اور منطقی طور پر پیدا ہوئی جس کی بناء پر ان کے لئے نظمِ جماعت کا قیام ضروری ہوا۔ چنانچہ آپؐ نے اس بیعت کے بعد بارہ نقباء کا تقرر فرمایا، جن میں سے نو حضرات قبیلہ خزرج میں سے تھے (اور ان میں سے ایک خود حضرت عبادہ ابنِ صامتؓ بھی تھے) اور تین قبیلہ اوس میں سے ---- اور پھر ان نقباء سے ایک اضافی بیعت بھی لی جس کے الفاظ یہ ہیں:

> "آپؐ نے فرمایا: آپ لوگ اپنی قوم کے جملہ معاملات کے کفیل ہیں جیسے حواری حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے کفیل تھے اور میں اپنی قوم یعنی جملہ مسلمانوں کا کفیل ہوں ---- اس پر ان سب نے کہا: جی ہاں ہمیں قبول ہے!" (سیرت ابنِ ہشام)

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ لحاظ ہے کہ جیسے قرآن حکیم نے متعدد مقامات پر تمام انبیاء اور رسولوں کو ایک امت قرار دیا ہے (جیسے مثلاً سورۃ الانبیاء: ۹۲) ایسے ہی ان کے حالات حتیٰ کہ بعض اوقات اعداد و شمار میں بھی گہری مماثلت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم بنی اسرائیل میں بھی بارہ ہی نقیب مقرر کئے تھے (سورۃ المائدہ: ۱۲) اور حضرت مسیحؑ کے حواری بھی بارہ ہی تھے ---- اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر ایمان لانے والوں کی کل تعداد بھی ۷۲ ہی تھی ---- جو ان مرد صحابہؓ کی تھی جنہوں نے عقبۂ ثانیہ میں آپؐ سے بیعت کی تھی۔

ان دو امور کے پیشِ نظر نیت کا کوئی فتور ہی انسان کی نگاہ سے اس حقیقت کو اوجھل رکھ سکتا ہے کہ یہ درحقیقت "بیعت جماعت" تھی جس کی بناء پر ایک جماعتی نظم قائم ہوا ---- اور داعیٔ اعظم، قائدِ اعلیٰ اور امیرِ مطلق (صلی اللہ علیہ وسلم) کے

ماتحت امراء اور نقباء کا نصب عمل میں آیا۔ اور ان کے ضمن میں بھی یہ صریح "عہد" لے لیا گیا کہ ان سے جھگڑا نہیں کیا جائے گا بلکہ ان کے ساتھ بھی "سمع و طاعت" کا تعلق قائم رہے گا، اس لئے کہ کسی بھی جماعت میں امیر صرف ایک ہی نہیں ہوتا بلکہ درجہ بدرجہ امراء کا ایک سلسلہ ہوتا ہے اور جب تک اس زنجیر کی ساری کڑیاں باہم پوری طرح مربوط نہ ہوں کوئی بامعنی اور نتیجہ خیز جدوجہد ممکن نہیں ہے۔ البتہ ماتحت امراء یا نقباء کی سمع و طاعت دو شرائط سے مشروط تھی: (i) ایک یہ کہ اطاعت محدود ہوگی یعنی ایسے احکام کے ضمن میں ہوگی جو شارعِ مطلق یعنی اللہ اور رسولؐ کے کسی حکم کے منافی نہ ہوں جنہیں عرفِ عام میں "معروف" کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ عقبہ کی پہلی بیعت کے الفاظ میں اور قرآن میں وارد شدہ "بیعت النساء" کے الفاظ میں یہ لفظ (معروف) خود آنحضورؐ کی اطاعت کے ضمن میں بھی موجود ہے ——— البتہ بیعت عقبۂ ثانیہ میں آنحضورؐ کی اطاعت مردوں کے ضمن میں، جنہیں جہاد و قتال کی کٹھن وادیوں سے گزرنا تھا، ایک درجہ بلند تر ہوکر "مطلق" بن گئی ہے جبکہ ماتحت امراء کے ضمن میں اس معروف کی شرط کو منفی اسلوب میں نمایاں کردیا گیا ہے یعنی "الا یہ کہ تم اپنے امراء کی جانب سے کسی ایسی بات کا مشاہدہ کرو جو کفرِ صریح ہو اور جس کے لئے تمہارے پاس اللہ کی جانب سے واضح دلیل اور برہان موجود ہو" (ii) دوسرے یہ کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماتحت امراء سے نہ اختلاف کیا جاسکتا ہے، نہ تنقید کی جاسکتی ہے، نہ مشورہ دیا جاسکتا ہے۔ بلکہ یہ جملہ حقوق ان کے تابع "مامورین" کو حاصل رہیں گے ——— اگرچہ آخری فیصلہ صاحبِ امر ہی کے ہاتھ میں ہوگا، الا یہ کہ معاملہ حدودِ شریعت سے نکل جائے!

لیکن دوسری جانب یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہئے کہ ان دو شرائط کے ساتھ مشروط اور محدود ہوجانے کے باوجود ماتحت امراء کی اطاعت کی اہمیت اور لزوم کا عالم یہ ہے کہ آپؐ نے متعدد احادیث کی رو سے فرمایا:

مَنْ اَطَاعَنِی فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَ مَنْ عَصَانِی فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ وَ مَنْ اَطَاعَ اَمِیْرِی فَقَدْ اَطَاعَنِی وَ مَنْ عَصٰی اَمِیْرِی فَقَدْ عَصَانِی (بخاری، عن ابی ہریرہؓ)

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے (مقرر کردہ) امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی!"

چنانچہ میری تحقیق یہی ہے کہ غزوۂ احد میں جو حادثہ پیش آیا اس میں بھی پینتیس تیر اندازوں نے آنحضورؐ کی نافرمانی نہیں کی تھی' اس لئے کہ آپؐ کے حکم کی تو انہوں نے یہ تاویل کرلی تھی کہ وہ شکست کی صورت میں تھا' فتح کی صورت میں نہیں' البتہ صریح حکم عدولی مقامی کمانڈر یا امیر حضرت عبداللہ ابن جبیرؓ کی تھی جو انہیں آخری وقت تک روکتے رہے تھے۔

اب ایک نگاہ اس جانب بھی ڈالیں کہ کس اعجازِ بلاغت و فصاحت اور غایتِ اختصار و اجمال' لیکن حد درجہ حصر اور جامعیت کے ساتھ اس حدیث مبارکہ میں وارد شدہ الفاظ میں ایک "اسلامی انقلابی جماعت" یعنی "حزب اللہ" کے لئے ابدی و سرمدی دستور العمل عطا فرمادیا گیا ہے!

چنانچہ سب جانتے ہیں کہ "سمع و طاعت" کے راستے میں بالعموم تین ہی رکاوٹیں حائل ہو سکتی ہیں (i) یہ کہ انسان کسی ایسی مشکل یا مخمصہ میں گرفتار ہو کہ کسی حکم پر عمل محال نظر آئے (ii) یہ کہ طبیعت میں انشراح اور آمادگی نہ ہو' جس کی دو وجوہات ممکن ہیں: ایک یہ کہ طبیعت پر ویسے ہی کسل اور انقباض کی کیفیت طاری ہو' یا یہ کہ کسی فیصلے کی حکمت اور مصلحت پر دل و دماغ مطمئن نہ ہوں اور (iii) یہ کہ انسان محسوس کرے کہ عہدوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم میں اسے اہل تر یا زیادہ سینئر ہونے کے باوجود نظر انداز کردیا گیا ہے اور دوسرے "نوواردوں" کو یہ اعزازات عطا کردیئے گئے ہیں (جیسے کہ جنگِ موتہ میں سپہ سالاری حضرت زیدؓ بن

حارثہ کو عطا کردی گئی تھی اور آنحضورؐ نے اس جیش کی سرداری حضرت اسامہؓ ابنِ زیدؓ ایسے نوجوان کو عطا کردی تھی جس میں جلیل القدر "**اَلسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ**" میں سے بھی متعدد حضرات شریک تھے)

ان تینوں امور اور موانع کے ضمن میں صراحتاً اقرار کرالیا گیا کہ ان تینوں اسباب میں سے کسی کو بھی "سمع و طاعت" کی راہ میں حائل ہونے نہیں دیں گے! مزید برآں یہ بھی طے کردیا گیا کہ ماتحت امراء کے تقرر کا اختیار بھی پورے کا پورا آنحضورؐ ہی کو حاصل ہوگا اور اس معاملے میں بھی کسی الیکشن یا انتخاب کا سوال پیدا نہیں ہوگا۔ گویا یہ "نامزد" ہوں گے جیسے کہ انصار کے بارہ نقباء آنحضورؐ کے نامزد کردہ تھے (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین!)

الغرض حزب اللہ یعنی اسلامی انقلابی جماعت کی تاسیس کی واحد منصوص (اس لئے کہ اس کا ذکر قرآن حکیم اور حدیثِ نبوی دونوں میں ہے) اور ماثور و مسنون اساس "بیعت سمع و طاعت" ہے جس میں آنحضورؐ کے زمانے کے ماتحت امراء پر قیاس کرتے ہوئے "**فِي الْمَعْرُوْف**" کی شرط کا اضافہ لازمی ہے۔ اس لئے کہ آنحضورؐ پر ختمِ نبوت کے بعد اب کوئی انسان' خواہ وہ خلفاءِ راشدینؓ ہی تھے' نہ نبی تھے نہ معصوم (واضح رہے کہ یہ موقف اہلِ سنت کا ہے' امامت معصومہ کے قائلین کا معاملہ جدا ہے' خواہ وہ اثنا عشری شیعہ ہوں' خواہ اسماعیلی خوجے' خواہ داؤدی بوہرے) لہٰذا جس طرح آپؐ کے زمانے میں آپؐ کے مقرر کردہ نائبین اور ماتحت امراء کی اطاعت بھی "معروف" کے دائرے میں محدود تھی اسی طرح آپؐ کے بعد آپؐ کے خلفاء اور زمانہ مابعد میں مسلمانوں کے تمام حکمرانوں اور اسلام کے عملی غلبہ کے لئے جدوجہد کرنے والی تمام جماعتوں کے داعیوں اور امیروں میں سے بھی کسی کی اطاعت مطلق نہ پہلے کبھی تھی نہ آئندہ کبھی ہوگی' بلکہ پہلے بھی "معروف" کے دائرے میں محدود تھی اور آئندہ بھی رہے گی۔

البتہ یہ تاریخی حقیقت یاد رکھنے کے قابل ہے کہ گزشتہ چودہ سو سال کے

دوران (موجودہ بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر کے سوا) مسلمانوں میں جو اجتماعی نظام بھی قائم ہوا بیعت ہی کی بنیاد پر قائم ہوا۔ چنانچہ خلافت راشدہ تھی تو بیعت کی اساس پر اور پھر دورِ ملوکیت آیا تو اس کی بنیاد بھی بیعت ہی پر تھی اور اس کی اصلاح کے لئے جو جدوجہد ہوئی خواہ وہ دور بنو امیہ میں حضرت حسینؓ ابنِ علیؓ نے کی، خواہ عبداللہؓ ابنِ زبیرؓ نے اور خواہ دورِ عباسی میں حضرت محمد ابنِ عبداللہ المعروف بہ نفس زکیہؒ نے، ان سب کی اساس بھی بیعت ہی پر قائم تھی ـــــ (چنانچہ حضرت حسینؓ کی بیعت کے ضمن میں تو بہت ہی پیارا شعر کہا ہے فیض نے کہ ۔ "دعوتِ بیعتِ شہؓ پہ ملزم بنا۔ کوئی اقرار پر کوئی انکار پر!") پھر گذشتہ صدی میں بھی جتنی احیائی تحریکیں اٹھیں اور جہاد کے غلغلے بلند ہوئے، خواہ وہ لیبیا کے سنوسیؒ کی تحریک تھی، خواہ سوڈان کے مہدیؒ کی اور خواہ برِعظیم پاک و ہند کی عظیم تحریکِ شہیدینؒ تھی سب کے لئے اجتماعی نظم کا ڈھانچہ بیعت ہی پر استوار ہوا تھا ـــــ حتیٰ کہ اس بیسویں صدی کے ربعِ اول کے دوران بھی (i) ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماءِ ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس میں مولانا محمود حسنؒ کی تحریک پر تجویز پیش ہوئی تھی کہ کسی کو امام الہند مان کر اس کے ہاتھ پر بیعت کرلی جائے، لیکن افسوس کہ یہ پہلے ایک صاحب کے خالص فنی اعتراض کی بناء پر ملتوی ہوئی اور پھر اصل مجوز کے انتقال کے باعث متروک ہوگئی (ii) اور ان ہی ایام کے لگ بھگ مصر میں "الاخوان المسلمون" نامی عظیم تنظیم و تحریک کا آغاز بھی چھ اشخاص کے شیخ حسن البناء شہیدؒ کے ہاتھ پر بیعت کرنے ہی سے ہوا تھا!۔

لیکن افسوس کہ بعد میں یہ مسنون و ماثور اساس متروک ہوگئی اور جس طرح کسی شاعر (غالباً عرشی بھوپالی) نے عہدِ حاضر کے نوجوانوں سے گلہ کیا تھا کہ ۔

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں الجھ کر اکثر
تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیئے

اور ۔

نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض
اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیئے

اسی طرح آج کی اکثر دینی جماعتیں اور مذہبی تنظیمیں اپنی تنظیمی ہیئت کے لئے مغرب سے درآمد شدہ نظام جماعت ہی کو اختیار کئے ہوئے ہیں ـــــ لیکن کیا عجب کہ ع "کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!" کے مصداق ہم اپنے اس ماثور و مسنون طریقے کی طرف رجوع کرلیں ـــــ جو محض منصوص ہونے کی بناء پر ہی نہیں، عقلی اور منطقی اعتبار سے بھی کسی حقیقی اور واقعی انقلاب کے لئے واحد لائحہ عمل ہے، اس لئے کہ انقلاب نہ انجمنوں اور سوسائٹیوں کے ذریعے برپا کیا جاسکتا ہے، نہ ڈھیلی ڈھالی سیاسی یا اصلاحی تنظیموں کے ذریعے ـــــ بلکہ اس کے لئے تو ایسی "جماعت" لازمی اور لابدی ہے جس کا نظم مضبوط اور ڈسپلن فوج کے مانند ہو ـــــ اور اس تاریخی حقیقت کے اقرار و اعتراف سے تو گریز ممکن ہی نہیں کہ یہی "بیعت سمع و طاعت فی المعروف" کا اصل حاصل ہے ـــــ اور یہی وہ اساس تھی جس پر اب سے چودہ سو سال قبل کی "حزب اللہ" کا قیام عمل میں آیا تھا!

بقیہ: چہرے کا پردہ

رہے ہیں۔ ہمارا اور مغرب کا مقابلہ کپڑے کی دو دھجیوں ہی کا ہے۔ ہم عورت کے چہرے پہ نقاب دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ عورت کو صرف بکنی کے ساتھ اسٹیج پر لانا چاہتے ہیں۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ آپ کا قدم کس سمت میں بڑھ رہا ہے۔ ہمارا اصول زیادہ سے زیادہ لباس اور حجاب کا ہے، ادھر کا اصول کم سے کم لباس اور نفیِ حجاب کا ہے۔

یہ ہے درپیش کشمکش! اس میں اپنا مقام اور اپنا پارٹ سوچ لیجئے۔ اس سے بے پروا ہو جائیے کہ آپ کو رجعت پسند کہا جاتا ہے یا ماڈرن اور ترقی پسند، فکر اس کی کیجئے کہ آپ کا مقام بہ حیثیت خادمِ برحق کہاں ہونا چاہئے، اور اب آپ کہاں کھڑے ہیں۔ ہمارا شعور دینی تو یہ کہتا ہے۔۔

ہوس کی نظریں غلاظت کی کھیاں گویا
چھپاؤ، چہرہ چھپاؤ، زمانہ نازک ہے

پندرہواں کبیرہ

روزہ خوری

مؤلف : ابو عبدالرحمٰن بشیر بن نور

روزہ جس طرح پہلی اُمتوں پر فرض رہا ہے اِسی طرح امّتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی فرض ہے۔ روزہ کے ذریعے کھانے پینے اور جنسی شہوات سے روکنے کا مقصد انسان میں تقویٰ اور خدا خوفی پیدا کرنا اور اسے دوسروں کی مشکلات و پریشانیوں کا احساس دلانا ہے۔ اِسی لیے نہ صرف روزہ ماہِ رمضان میں فرض قرار دیا گیا بلکہ متعدد مواقع پر بطور نفل اس کے اہتمام کی ترغیب دلائی گئی، جن لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بلند درجات، مغفرت اور اجرِ عظیم کا انتظام کیا ہے اُن کی خوبیوں اور اوصاف میں دیگر نیک کاموں کے علاوہ روزے کا بڑے اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

إِنَّ الْمُسْلِمِينَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْقَانِتِينَ وَالْقَانِتَاتِ وَالصَّادِقِينَ وَالصَّادِقَاتِ وَالصَّابِرِينَ وَالصَّابِرَاتِ وَالْخَاشِعِينَ وَالْخَاشِعَاتِ وَالْمُتَصَدِّقِينَ وَالْمُتَصَدِّقَاتِ وَالصَّائِمِينَ وَالصَّائِمَاتِ وَالْحَافِظِينَ فُرُوجَهُمْ وَالْحَافِظَاتِ وَالذَّاكِرِينَ اللَّهَ كَثِيرًا وَالذَّاكِرَاتِ أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا[1]

"بالیقین جو مرد اور جو عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے اُن کے لیے مغفرت اور بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے"

روزہ اگر ایک طرف حوصلہ، صبر اور نفسِ امارہ پر غلبہ پانے کی عملی تربیت ہے تو دوسری طرف اجرِ عظیم، مغفرت

---

[1] سورت الاحزاب، آیت ۳۵۔

اور شفاعتِ اُخروی کا سامان ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ جنسی شہوت کا بہترین علاج بھی ہے منندرجہ ذیل احادیث کی روشنی میں یہ سب باتیں روزِ روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ يَسْتَجِنُّ بِهَا الْعَبْدُ مِنَ النَّارِ۔[1]

"روزے ڈھال ہیں۔ بندہ ان روزوں کے ذریعے آگ سے اپنے بچاؤ کا سامان کر لیتا ہے۔"

مزید فرمایا:

يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ البَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ۔[2]

"اے نوجوانو! تم میں سے جس کے پاس استطاعت ہو وہ شادی کرلے، کیونکہ نکاح نگاہ نیچی رکھنے میں بڑا معاون ہے، شرمگاہ کی حفاظت کا بہترین سامان ہے۔ اور جس کے پاس نکاح کی استطاعت نہ ہو وہ پابندی سے روزے رکھے۔ روزہ اس کی شہوت کا بہترین تریاق ہے۔"

روزے کا اہتمام انسان کو جہنم کی آگ سے کوسوں دُور کر دیتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَا مِنْ عَبْدٍ يَصُومُ يَوْمًا فِي سَبِيلِ اللهِ إِلَّا بَاعَدَ اللهُ بِذٰلِكَ الْيَوْمِ وَجْهَهُ عَنِ النَّارِ سَبْعِينَ خَرِيفًا۔[3]

"جو بندہ ایک دن اللہ کی راہ میں روزہ رکھے گا اللہ تعالیٰ اس ایک دن کے بدلے میں اس کا چہرہ

---

[1] مسند امام احمد، ج ۳ ص ۲۴۱، ج ۳ ص ۲۹۶، ج ۴ ص ۲۲۔ حدیث کی سند صحیح ہے۔ اس سے ملتے جلتے لفظوں کے ساتھ یہ حدیث صحیح مسلم کتاب الصیام باب فضل الصیام میں ہے۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف علی نفسہ۔ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح .....

[3] صحیح بخاری، کتاب الجہاد، باب فضل الصوم فی سبیل اللہ۔

صحیح مسلم کتاب الصیام، باب فضل الصیام۔ لفظ صحیح مسلم کے ہیں۔

ستر سال کے لیے جہنم سے دُور کر دیں گے۔"

روزہ ایسا نیک عمل ہے جو انسان کو جنت تک پہنچا کر رہتا ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللهِ دُلَّنِي عَلَى عَمَلٍ أَدْخُلُ بِهِ الْجَنَّةَ. قَالَ: عَلَيْكَ بِالصَّوْمِ، لَا مِثْلَ لَهُ۔[1]

میں نے دریافت کیا: یارسول اللہ! مجھے ایسا کام بتا دیں جس پر عمل کر کے میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "روزے کا اہتمام کرو۔ اس جیسا کوئی دوسرا عمل نہیں۔"

روزہ اُن عظیم المرتبت کاموں میں سے ہے جو قیامت کے روز شفاعت کرے گا۔ اور اس کی شفاعت بارگاہِ خداوندی میں قبول بھی ہوگی۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الصِّيَامُ وَالْقُرْآنُ يَشْفَعَانِ لِلْعَبْدِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، يَقُولُ الصِّيَامُ: أَيْ رَبِّ مَنَعْتُهُ الطَّعَامَ وَالشَّهْوَةَ، فَشَفِّعْنِي فِيهِ، وَيَقُولُ الْقُرْآنُ: مَنَعْتُهُ النَّوْمَ بِاللَّيْلِ، فَشَفِّعْنِي فِيهِ، قَالَ: فَيُشَفَّعَانِ۔[2]

"روزہ اور قرآن قیامت کے روز بندے کے حق میں شفاعت کریں گے۔" روزہ کہے گا: "اے پروردگار! میں نے اسے کھانے اور شہوت پوری کرنے سے روکا تھا، لہٰذا اس کے حق میں میری شفاعت قبول فرمالیں۔"

قرآن کہے گا: "میں نے اسے رات کو سونے نہیں دیا، لہٰذا میری شفاعت اس کے حق میں قبول فرمالیں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پس ان دونوں کی شفاعت قبول کر لی جائے گی۔"

---

[1] سنن النسائی، ۴/۱۶۵۔ ابن حبان (الموارد، ص ۲۳۲)، المستدرک للحاکم، کتاب الصیام، ابتداء میں۔

[2] مسند احمد، ج ۲، ص ۱۷۴، حدیث ۶۶۲۶۔ المستدرک للحاکم، کتاب فضائل القرآن، باب الصیام والقرآن یشفعان، سند صحیح ہے، تحقیق احمد شاکر۔

ہر نیک کام کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہے لیکن روزے کا اجر و ثواب بلا حساب اور لامحدود ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

كُلُّ عَمَلِ ابْنِ آدَمَ يُضَاعَفُ، الْحَسَنَةُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا إِلَى سَبْعِ مِئَةِ ضِعْفٍ، قَالَ اللهُ عزوجل: إِلَّا الصَّوْمَ، فَإِنَّهُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ، يَدَعُ شَهْوَتَهُ وَطَعَامَهُ مِنْ أَجْلِي، لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ: فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهِ، وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهِ، وَلَخَلُوفُ فِيهِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ۔[1]

"ہر انسان کا عمل بڑھایا جاتا ہے، نیکی کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: البتہ روزے کا مسئلہ مختلف ہے، کیونکہ وہ میرے ہی لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ روزہ دار میری خاطر اپنی شہوت اور کھانا چھوڑ دیتا ہے۔ روزے دار کے لیے دو خوشیاں ہیں، ایک خوشی افطار کے وقت اور دوسری خوشی اپنے رب سے ملاقات کے وقت۔ اور روزے دار کے منہ کی ناپسندیدہ بُو اللہ تعالیٰ کو کستوری سے زیادہ عزیز ہے۔"

یہ ہیں وہ چند ایک مناقب و فضائل جو روزے کے ضمن میں کتاب اللہ اور سنّت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بیان ہوئے ہیں۔ اس سب کو جان لینے کے بعد بھی کوئی بدنصیب اور قسمت کا مارا ہوا اپنی آخرت نہ سنوارے بلکہ صحت مند، تندرست اور توانا ہونے کے باوجود روزے نہ رکھے تو یقیناً وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کا مستحق ہے۔ آپ رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل امین کے کہنے پر اس کے خلاف بددعا کی، جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

..... أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَعِدَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ: "آمِينَ آمِينَ، آمِينَ" قِيلَ: يَا رَسُولَ اللهِ: إِنَّكَ صَعِدْتَ الْمِنْبَرَ فَقُلْتَ:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام۔

"آمِیْن آمِیْن آمِیْن" فَقَالَ: اِنَّ جِبْرَائِیْلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَتَانِی فَقَالَ: مَنْ اَدْرَکَ شَھْرَ رَمَضَانَ فَلَمْ یُغْفَرْ لَہٗ فَدَخَلَ النَّارَ فَاَبْعَدَہُ اللّٰہُ قُلْ: آمِیْن فَقُلْتُ: آمِیْن۔۔۔الخ"[1]

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر چڑھتے ہوئے تین مرتبہ آمین آمین آمین کہا۔ کسی نے وجہ دریافت کی کہ یارسول اللہ آپؐ نے منبر پر چڑھتے ہوئے آمین آمین آمین کہا۔ اس کا کیا سبب ہے؟ آپ نے فرمایا: "جبریل امین علیہ السلام نے مجھے آکر کہا: "جس آدمی نے رمضان کا مہینہ پایا، پھر بھی اُس کی بخشش نہ ہوسکی اور نتیجۃً وہ آگ میں داخل ہوگیا تو اللہ اُسے ہلاک و برباد کرے اور اپنی رحمت سے مزید دُور کرے۔ جبریل علیہ السلام نے کہا، آپ آمین کہیں، تو میں نے آمین کہی۔۔۔۔الخ"

رمضان المبارک کا فرض روزہ نہ رکھنے والا سب سے پہلے اس بددعا کی زد میں آتا ہے اور وہ لوگ بھی اس بدُعا کے اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتے جو رمضان المبارک کے سنہری موقع سے فائدہ نہیں اُٹھاتے، بلکہ اس کے آداب و احکام کی خلاف ورزی کرکے مزید وبال اپنے سر لے لیتے ہیں۔ احکام و آدابِ رمضان میں لاپروائی کا جو انجام نکل سکتا ہے وہ درج ذیل حدیث سے بہت واضح ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

بَیْنَمَا اَنَا نَائِمٌ اَتَانِی رَجُلَانِ فَاَخَذَا بِضَبُعِی فَاَتَیَابِی جَبَلاً وَعْرًا فَقَالَا، اِصْعَدْ، فَقُلْتُ: اِنِّی لَا اُطِیْقُہٗ فَقَالَا: سَنُسَھِّلُہٗ لَکَ فَصَعِدْتُ، حَتّٰی اِذَا کُنْتُ فِی سَوَاءِ الْجَبَلِ اِذَا بِاَصْوَاتٍ شَدِیْدَۃٍ قُلْتُ، مَاھٰذِہِ الْاَصْوَاتُ؟ قَالُوا: ھٰذَا عُوَاءُ اَھْلِ النَّارِ ثُمَّ انْطُلِقَ بِی، فَاِذَا اَنَا بِقَوْمٍ مُعَلَّقِیْنَ بِعَرَاقِیْبِھِمْ، مُشَقَّقَۃً اَشْدَاقُھُمْ، تَسِیْلُ اَشْدَاقُھُمْ دَمًا قَالَ: قُلْتُ: مَنْ ھٰؤُلَاءِ؟

---

[1] صحیح ابن حبان۔ مسند امام احمد، ج ۲، ص ۲۴۶، اور ص ۲۵۴۔
سنن البیہقی، کتاب الصیام، باب فی فضل شہر رمضان، ج ۴، ص ۳۰۴۔

قَالَ : الَّذِيْنَ يُفْطِرُوْنَ قَبْلَ تَحِلَّةِ صَوْمِهِمْ[1]

"میں سو رہا تھا کہ میرے پاس دو آدمی آئے (جو درحقیقت فرشتے تھے) وہ میرا بازو پکڑ کر ایک پُرپیچ ناہموار پہاڑ کے پاس لے آئے اور کہا: اُوپر چڑھیے۔ میں نے کہا: میں ایسے پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتا۔ انہوں نے کہا: ہم راستہ آپ کے لیے ہموار کیے دیتے ہیں۔ چنانچہ میں چڑھ گیا۔ جب میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو وہاں میں نے بہت پُرشور آوازیں سُنیں۔ میں نے دریافت کیا: یہ کیسی آوازیں ہیں؟ انہوں نے بتایا: یہ جہنم والوں کی چیخ و پکار ہے۔ پھر وہ مجھے لے کر آگے چل پڑے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ ایڑیوں سے بندھے ہوئے اوندھے منہ لٹکے ہوئے ہیں اور اُن کی باچھیں چری ہوئی ہیں، جن سے خون بہہ رہا ہے۔ میں نے پوچھا: یہ کون لوگ ہیں؟ فرشتے نے کہا: یہ وہ لوگ ہیں جو وقت سے پہلے روزہ افطار کر لیتے ہیں۔"

غور فرمایئے کہ اگر قبل از وقت روزہ افطار کر لینے والے کی یہ سزا ہے جیسا کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاہدہ فرمایا تو بالکل روزہ نہ رکھنے والوں کی کیسی ہوگی؟ بس اتنی بات پر غور اور توجہ کر لینے سے ساری حقیقت سمجھ میں آسکتی ہے بشرطیکہ دماغ سوچنے کے قابل ہو اور دل مرنہ چکا ہو۔

---

[1] المستدرک للحاکم، کتاب الصوم، باب عذاب من یفطر الصوم قبل وقتہ، ج ۱ ص ۴۳۰۔ امام حاکم نے حدیث کے شروط مسلم کے مطابق صحیح قرار دیا ہے اور امام ذہبی نے اس حکم کی تائید کی ہے۔ صحیح ابن حبان۔ حدیث ۱۸۰۰۔

برطانیہ میں تنظیم اسلامی کا رابطہ دفتر

لندن میں تنظیم اسلامی کا رابطہ دفتر جہاں سے

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی مطبوعات' دروس و تقاریر کے کیسٹ اور

'میثاق' و 'ندائے خلافت' کا حصول ممکن ہے' درج ذیل ہے:

Mr. Zahoor ul Hassan Butt

18 Garfield Road Enfield Middx

En3, 4 RP London (U.K)

Phone 081 - 805 - 8732 (Timings 4p.m to 8 - 30 a.m)

نعیم صدیقی

چہرے کا پردہ

جناب نعیم صدیقی صاحب کا زیر نظر مضمون اس سے قبل تین اقساط کی صورت میں روزنامہ 'پاکستان' میں شائع ہو چکا ہے۔ موضوع چونکہ نہایت اہم ہی نہیں زباں زد خاص و عام بھی ہے اور پھر نعیم صاحب کی محنت و کاوش اور مخصوص انداز نگارش نے اسے بحیثیت مجموعی نہایت مفید بھی بنا دیا ہے لہٰذا اسے ہدیہ قارئین میثاق کیا جا رہا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے پردے کے معاملے میں جماعت اسلامی کے ترقی پسند عناصر اور بعض اسلام پسند دانشوروں کے پھیلائے ہوئے غلط افکار کی تردید میں اور غیر محرموں سے چہرہ کے پردے کی تائید میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی تحریروں سے اقتباسات پیش کئے ہیں اور اپنے مضمون میں بہت سا مفید مواد جمع کیا ہے۔ تاہم ہمیں فاضل مضمون نگار کی خدمت میں بصد ادب و احترام یہ کہنا ہے کہ محترم' پانی وہیں مرتا ہے جہاں سے آپ دلائل دے رہے ہیں۔ اصل کمزوری مولانا مودودی مرحوم کے اپنے موقف میں موجود ہے۔ فاضل مضمون نگار نے مولانا کی جن عبارات کا حوالہ دیا ہے انہی میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں "عورتوں کو بھی یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے گھروں میں محرم اور غیر محرم رشتہ داروں میں تمیز کریں اور غیر محرموں کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں" (تفہیم القرآن ج ۳' صفحہ ۳۲۴) گویا غیر محرموں کے سامنے ایک مسلمان خاتون کھلے چہرے کے ساتھ آسکتی ہے بشرطیکہ اس نے بناؤ سنگھار نہ کیا ہو۔ چنانچہ اس کی وضاحت مولانا کے ایک اور جملے سے ہوتی ہے۔ "عورتوں کے ایک قریبی حلقے کے سوا غیر محرم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے" (تفہیم القرآن ج ۳ صفحہ ۳۷۵) گویا اصل ممانعت زینت اور بناؤ سنگھار کے ساتھ غیر محرموں کے سامنے آنے کی ہے' اگر عورت زینت اختیار نہ کرے تو غیر محرموں کے سامنے آنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا کی یہ بات اگر تسلیم کر لی جائے تو غیر محرموں سے چہرے کا پردہ تو ختم ہوا اور اس طرح سورۃ النور کی آیت نمبر ۳۱ غیر ضروری قرار پاتی ہے جس میں ان افراد کی طویل فہرست دی گئی ہے جن کے سامنے عورت کھلے چہرے کے ساتھ جا سکتی ہے' جس کا سیدھا سا مطلب یہ ہے کہ اس فہرست سے جو بھی باہر ہے اس سے عورت کو پردہ کرنا ہے۔ مولانا کی تحریر کردہ اس نوع کی بعض عبارات ایک قاری کو خلجان میں مبتلا کرتی ہیں ورنہ مولانا کے مجموعی موقف کو سامنے رکھا جائے تو اس کا منطقی نتیجہ بھی یہی سامنے آتا ہے کہ ہر غیر محرم سے مسلمان عورت کا مکمل پردہ ہو' خواہ وہ غیر محرم اجنبی ہو یا قریبی رشتہ دلیثا ___ بلکہ غیر محرم رشتہ داروں کا معاملہ زیادہ حساس ہو جاتا ہے اور ان کی بے محابا گھروں میں آمد و رفت زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ ان کے معاملے میں اپنے موقف میں لچک پیدا کرنا شدید فتنے کا دروازہ کھولنے کا باعث بن سکتا ہے۔

زیر نظر مضمون جماعت کی اندرونی فکری کشاکش کا بھی ایک نمایاں مظہر ہے۔ فاضل مضمون نگار کا شمار جماعت کے سابقون الاولون کی باقیات الصالحات میں ہوتا ہے جنہیں جماعت کی موجودہ قیادت تو شاید از کار رفتہ شمار کرے تاہم ہمارے نزدیک پردے کے بارے میں فاضل مضمون نگار کے خیالات نہایت وقیع ہیں۔ (ادارہ)

کچھ دوستوں، عباداللہ اور اماء اللہ نے مجھ سے لکھ کر بھی اور بالمشافہ بھی قریباً ایک سال کے عرصے میں بار بار پوچھا کہ کیا چہرے کو بے حجاب رکھنے کی پابندی ہے یا گھر سے باہر چہرہ کھلا یا بے حجاب رکھنے کا طریقہ بروئے کتاب و سنت و عقل جائز ہے' یا عورت کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ چہرہ کھلا رکھے یا نہ رکھے۔ پوچھنے والوں نے یہی کہا کہ ہمیں بتایا گیا ہے' لکھا گیا یا ترغیب دلائی گئی ہے کہ چہرہ کھلا رکھنا چاہیے۔

اس سوال پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ۱۹۴۱ء سے پہلے مولانا مودودیؒ نے اس پر سوچا' تحقیق کی اور اپنے خیالات بیان فرمائے' حتیٰ کہ اخبار "جمعیۃ" کی ادارت کے زمانے میں (۱۹۲۵ء تا ۱۹۲۸ء) میں اخباری مضامین اور واقعاتی احوال پر نوٹ لکھتے ہوئے بھی انہوں نے مسئلۂ حجاب پر لکھا' سوالوں کے جواب دیئے' "پردہ" نامی کتاب میں تحقیق کا حق ادا کر دیا اور کتاب و سنت کی حکمتوں کو واقعاتی اور عقلی دلائل سے ثابت کر دیا۔ لوگ اس مسلک کو پہلے قبول کر کے جماعت کے اندر آئے' یا جماعت میں آ کر انہوں نے قانونِ حجاب کو سمجھا۔ خود سمجھا ہی نہیں بلکہ اپنے گھروں میں رائج کیا اور اپنے دعوتی حلقوں میں اسے پیش کیا۔ نصف صدی سے زائد عرصے تک ایک جماعت کی جماعت اس مسلک پر پورے اطمینان سے چلتی رہی۔ حال یہ تھا کہ "طلوعِ اسلام" اس معاملے میں بھی' اور دوسرے مسائل میں بھی مولانا مودودیؒ کا نام لے کر اور جماعت کو نشانہ بنا کر حملے کرتا رہا۔ مولانا جعفر ندوی مرحوم نے بھی اپنا حصہ ادا کیا' لیکن مولانا مودودیؒ کے طوفانِ استدلال کے سامنے کوئی چٹان ٹک نہ سکی۔ کسی خاتون کے برقعے کے قلعے کو ہزار طرح نشانہ بنانے والے ایک چھید تک نہ کر سکے۔ اور عورت اگر ایمانیات اور دینی احکام و حدود کے معاملے میں ضد (یا بالفاظ صحیح استقامت و عزیمت) پر آ جائے تو اٹکل پچو حجت بازیاں اور دانشورانہ مہارتیں یا مناصب و جاہ کی مرعوبیتیں اسے اپنی جگہ سے ایک سنٹی میٹر بھی نہیں ہلا سکتیں اور جب وہ دل سے مانتی ہو کہ میں خدا اور اس کی شریعت اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں کوئی پابندی اپنے اوپر نافذ کر کے چل رہی ہوں تو پھر اس کی ایمانی و شعوری اور جذباتی قوت کا کیا حساب؟

مجھے حیرت ہے کہ ایک معاملے میں برصغیر جتنے بڑے ملک کے صدہا عالموں اور ہزاروں ارکان اور لاکھوں متفقین اور خیر خواہوں کو (مرد ہوں یا عورت) ۵۰ سال سے

زائد عرصے تک مولانا مودودیؒ کا مسلک اور ان کا استدلال اس قدر مطمئن اور ہم آہنگ رکھتا ہے کہ کبھی کوئی اضطرابی ہلچل واقع نہیں ہوتی' کبھی کوئی بحثا بحثی پیدا نہیں ہوتی۔ پھر کیا وہ شخص محض ایک جادوگر تھا جس کا عملِ تنویم اتنے عرصے تک (خود اس کی وفات کے بعد بھی) جاری رہا۔ کسی جماعت کو کسی نقطۂ نظر یا دینی مسئلے میں' یا معاشرتی طرزِ عمل میں اس درجہ کی یک آہنگی اور دلی تسلی حاصل ہو تو یہ تو وہ حالت ہوتی ہے کہ جسے حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت و کاوش اور تربیت و تزکیہ کی ضرورت ہے۔ اب میری ناقص عقل اس حکمت کو نہیں جان سکی جس کی وجہ سے حاصل شدہ یکسوئی کو درہم برہم کر کے کوئی طاقت جماعت کو بحثا بحثی میں مبتلا کر کے اس کے اندر انتشار کے جراثیم پھیلا دینا چاہتی ہے۔ اور چہرہ کھلا رکھنے کی لڑائی لڑنے کا موقع اگر تھا تو وہ اب گزر چکا۔ اب تو گردن اور سینہ' سر اور زلفیں' کلائیاں اور شانے اور باریک لباسوں کی آڑ میں جسم کے ابھار اور خط و خال' بعض مثالوں کے مطابق پوری رانیں نہیں تو پنڈلیاں تک کھل چکیں۔ بہت سے بندھن کٹ چکے' بہت سے بٹن ٹوٹ چکے' بہت سے جامے چاک ہو چکے' اب تو اجتہاد فرمائیں تو مزید کسی حصۂ جسم کے کھولنے کا اجتہاد برائے ترقی فرمائیں۔ قافلۂ انقلابِ تہذیب نکل کر دور کہیں جا چکا' اب اس کے نقوشِ قدم کو پیٹنے سے کیا حاصل۔ ہاں اگر رجعت پسندی (فنڈا مینٹل ازم) کے کسی رہے سہے داغ کو دھونے کا پروگرام ہے تو یہ کام کارکنانِ قضاوقدر نے امریکہ کے سپرد کر دیا ہے۔ امریکہ کا دردِ سر آپ کیوں سہیڑتے ہیں۔ ان الفاظ کی بنیاد جس تصور پر ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارا معاشرہ ایک ملحدانہ و مادہ پرستانہ تہذیب کے حملۂ مسلسل کی زد میں ہے' بلکہ اسے بہت فتوحات حاصل ہو چکی ہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ اس جنگاہ تاریخ میں آپ اپنی تہذیب' اپنے دین' اپنے تصورات اور قدروں کی حفاظت کے لئے کیا کر سکتے ہیں۔ چہرے کھلوایئے تو یہ دشمن تہذیب کی بڑی فتح ہو گی۔ آپ نے اپنی تہذیب کے لئے کیا کیا؟ کوئی ایک پوائنٹ بھی ہے' خدا کے لئے ان ہزارہا مردوں اور خواتین اور طالبات کے پائے استقامت کو اکھیڑنے کے لئے دلائل و نظائر لے کے نہ آیئے' یہ تعداد جو خدا کے کرمِ خاص سے بچ رہی ہے اور اپنی جگہوں سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹ رہی' اس کا احترام کیجئے اور اسے دشمن کلچر کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی ذلت پر مجبور نہ کیجئے۔ جب کوئی چہرہ کھلے گا تو

پھر اور بھی بہت کچھ کھلے گا' مگر ایسی مدھم رفتار سے کہ آپ چونکنے بھی نہ پائیں۔ بہرحال خدا کی ہزار رحمتیں ہوں ان خواتین پر جنہوں نے چہرہ چھپانے کی سخت پابندی کو رضاکارانہ طور پر اختیار کیا' اور جزائے موفور کی دعا ان کے لئے جنہوں نے گھروں میں نوخیز لڑکیوں اور کالجوں کی طالبات کو چہرہ چھپانے والے پردے کو اختیار کرنے کی مؤثر دعوت دی۔ نتیجہ یہ کہ آج برقعوں کی بہت بڑی فصل لہلہا رہی ہے جس پر شرم و حیا' عفت و پاکیزگی اور خدمتِ دین اور جذبۂ فلاحِ انسانیت کے خوشے لگ رہے ہیں۔ میری آنکھیں ان کے خیال سے احتراماً جھک جاتی ہیں جو مخالف پردہ معاشرے اور نقیض پردہ تحریک کا برسوں سے بصد ہمت مقابلہ کر رہی ہیں' جبکہ ان کے گردوپیش مردوں کے ضمیروں کے کشتوں کے پشتے لگے ہوئے ہیں اور عورتیں حملہ آور کے سامنے ہاتھ جوڑے خوشی منا رہی ہیں۔

خیر یہ مبحث سامنے آیا تو براہِ راست تحقیق کرنے کا ارادہ کیا' مگر وقت کی کمی اور صحت کی کمزوری کی وجہ سے یہ سوچا کہ ایک بار مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب "پردہ" کو تو بغور دیکھ لوں اور مباحث کو تازہ کرلوں' وہاں سے تفصیلی حوالے بھی مل جائیں گے' مزید ضرورت ہوئی تو تفہیم القرآن کی سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب کو بھی بغور پڑھوں گا اور بعد میں ان سورتوں کے مباحث پڑھ بھی لئے۔ پہلے "پردہ" کا مطالعہ کرتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا کہ مولاناؒ نے کسی لحاظ سے کوئی کسر تو نہیں چھوڑی ہے۔ اللہ کا یہ بندہ اس وقت میدان میں نکلا جبکہ ابھی تہذیب دوں نہاد کی فتوحات اتنی نہ تھیں' خصوصاً عورت کے پردہ کے معاملہ میں بات ابھی زیادہ بگڑی نہ تھی۔ مگر بعد کے طوفان نے بتایا کہ کتنا ضروری کام مولانا مودودیؒ کر گئے۔ مگر بدقسمتی یہ کہ مولانا کی زندگی میں بھی ان کو ستانے والے کم نہ تھے' مگر زندگی کے بعد تو "من و شما" ہر کوئی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ مولانا کے دلائل کو ایک طرف رکھ کے اپنا تازہ تر اجتہاد ایک مینار کی طرح میدان میں سب کے سامنے کھڑا کر دے۔ ایسے کئی عطار کے لونڈے ہیں جن سے دین کے عظیم شیدائی اور زہادِ وقت دوا لیتے ہیں۔

مولانا مودودیؒ ایسا منظم طریقِ فکر استعمال کرتے تھے کہ ایک ایک مسئلہ الگ جزو کی طرح سامنے نہیں آتا بلکہ مولانا پورا ایک سسٹم اصولوں سے بناتے ہیں اور پھر ترتیب وار

اس میں ہر چیز کو Proper جگہ پر فٹ کرتے چلے جاتے ہیں کہ کسی بھی جز کے لئے مجموعی سسٹم خود ایک دلیل بن جاتا ہے کہ اس جزو کو کیا ہونا چاہئے اور کس طرح فٹ ہونا چاہئے۔ پہلے وہ اسلام کے پورے معاشرتی اور عائلی نظام کا اصولی فریم بناتے ہیں' پھر اس میں قانون زنا سے لے کر پردے کے ضابطوں تک ہر چیز کو نصب کر کے دکھاتے ہیں کہ کس جگہ کونسی اور کیسی چیز کی جگہ ہے۔ اس کا سادہ سا ایک تذکرہ ان کے مضمون "نمازیں بے اثر کیوں ہو گئیں" (خطبات) میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں میں خاص طور پر پردہ کے لئے انسداد زنا کی حیثیت متعین کرنے کے لئے اس سسٹم کو بیان کرتا ہوں جس میں ہر چیز اپنی جگہ ٹھیک نصب دکھائی دیتی ہے۔

"اسلام انسانی معاشرے کو زنا کے خطرے سے بچانے کے لئے صرف قانونی تعزیر کے ہتھیار پر اکتفا نہیں کرتا' بلکہ اس کے لئے وسیع پیمانے پر اصلاحی اور انسدادی تدابیر استعمال کرتا ہے اور یہ تعزیر اس نے محض ایک آخری چارۂ کار کے طور پر تجویز کی ہے۔ اس کا منشاء ہرگز یہ نہیں کہ لوگ اس جرم کا ارتکاب کرتے رہیں اور شب و روز ان پر کوڑے برسانے کے لئے ٹکٹکیاں لگی رہیں' بلکہ اس کا منشاء یہ ہے کہ لوگ اس کا ارتکاب نہ کریں اور کسی کو اس پر سزا دینے کی نوبت ہی نہ آنے پائے۔ وہ سب سے پہلے آدمی کے نفس کی اصلاح کرتا ہے' اس کے دل میں عالم الغیب اور ہمہ گیر طاقت کے مالک خدا کا خوف بٹھاتا ہے' اسے آخرت کی باز پرس کا احساس دلاتا ہے جس سے مر کر بھی آدمی کا پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ اس میں قانونِ الٰہی کی اطاعت کا جذبہ پیدا کرتا ہے جو ایمان کا لازمی تقاضا ہے' اور پھر اسے بار بار متنبہ کرتا ہے کہ زنا اور بے عصمتی ان بڑے گناہوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ سخت باز پرس کرے گا۔ یہ مضمون سارے قرآن میں جگہ جگہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس کے بعد وہ آدمی کے لئے نکاح کی تمام ممکن آسانیاں پیدا کرتا ہے' ایک بیوی سے تسکین نہ ہو تو چار چار تک سے جائز تعلق کا موقع دیتا ہے' دل نہ ملیں تو مرد کے لئے طلاق اور عورت کے لئے خلع کی سہولتیں بہم پہنچاتا ہے..... اسی سورۂ نور میں آپ ابھی دیکھیں گے کہ مردوں اور عورتوں کے بن بیاہے بیٹھے رہنے کو ناپسند کیا گیا ہے اور صاف حکم دے دیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے نکاح کر دیئے جائیں' حتیٰ کہ لونڈیوں اور غلاموں کو بھی مجرد نہ چھوڑا جائے۔ پھر وہ معاشرے میں سے ان اسباب کا خاتمہ

کرتا ہے جو زنا کی رغبت دلانے والے' اس کی تحریک کرنے والے اور اس کے لئے مواقع پیدا کرنے والے ہو سکتے ہیں۔ زنا کی سزا بیان کرنے سے ایک سال پہلے سورۂ احزاب میں عورتوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ گھر سے نکلیں تو چادریں اوڑھ کر اور گھونگھٹ ڈال کر نکلیں' اور مسلمان عورتوں کے لئے جس نبیؐ کا گھر نمونے کا گھر تھا اس کی عورتوں کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ گھروں میں وقار اور سکینت کے ساتھ بیٹھو' اپنے حسن اور بناؤ سنگھار کی نمائش نہ کرو' اور باہر کے مرد تم سے کوئی چیز لیں تو پردے کے پیچھے سے لیں۔ یہ نمونہ دیکھتے دیکھتے ان تمام صاحبِ ایمان عورتوں میں پھیل گیا جن کے نزدیک زمانۂ جاہلیت کی بے حیا عورتیں نہیں بلکہ نبیؐ کی بیویاں اور بیٹیاں تقلید کے لائق تھیں۔ اس طرح فوج داری قانون کی سزا مقرر کرنے سے پہلے عورتوں اور مردوں کی خلط ملط معاشرت بند کی گئی' بنی سنوری عورتوں کا باہر نکلنا بند کیا گیا' اور ان اسباب و ذرائع کا دروازہ بند کر دیا گیا جو زنا کے مواقع اور اس کی آسانیاں بہم پہنچاتے ہیں۔ ان سب کے بعد جب زنا کی فوجداری سزا مقرر کی گئی تو آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے ساتھ ساتھ اسی سورۂ نور میں اشاعتِ فحش کو بھی روکا جا رہا ہے' قحبہ گری (Prostitution) کی قانونی بندش بھی کی جا رہی ہے' عورتوں اور مردوں پر بدکاری کے بے ثبوت الزام لگانے اور ان کے چرچے کرنے کے لئے بھی سخت سزا تجویز کی جا رہی ہے' غضِ بصر کا حکم دے کر نگاہوں پر بھی پہرے بٹھائے جا رہے ہیں تاکہ دیدہ بازی سے حسن پرستی تک اور حسن پرستی سے عشق بازی تک نوبت نہ پہنچے اور عورتوں کو یہ حکم بھی دیا جا رہا ہے کہ اپنے گھروں میں محرم اور غیر محرم رشتہ داروں کے درمیان تمیز کریں اور غیر محرموں کے سامنے بن سنور کر نہ آئیں۔ اس سے آپ اس پوری اصلاحی اسکیم کو سمجھ سکتے ہیں جس کے ایک جزو کے طور پر زنا کی قانونی سزا مقرر کی گئی ہے۔ یہ سزا اس لئے ہے کہ تمام داخلی و خارجی اصلاح کے باوجود جو شریر النفس لوگ کھلے ہوئے جائز مواقع کو چھوڑ کر ناجائز طریقے سے ہی اپنی خواہشِ نفس پوری کرنے پر اصرار کریں ان کی کھال ادھیڑ دی جائے اور ایک بدکار کو سزا دے کر معاشرے کے ان بہت سے لوگوں کا نفسیاتی آپریشن کر دیا جائے جو اس طرح کے میلانات رکھتے ہوں۔ یہ سزا محض ایک مجرم کی عقوبت ہی نہیں بلکہ اس امر کا بالفعل اعلان بھی ہے کہ مسلم معاشرہ بدکاروں کی تفریح گاہ نہیں ہے جس میں ذواقین اور ذواقات اخلاقی

قیود سے آزاد ہو کر مزے لوٹتے پھریں۔ اس نقطۂ نظر سے کوئی شخص اسلام کی اس اصلاحی اسکیم کو سمجھے تو وہ بآسانی محسوس کر لے گا کہ اس پوری اسکیم کا ایک جزو بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹایا جا سکتا اور نہ کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں ردوبدل کا خیال یا تو وہ نادان کر سکتا ہے جو اسے سمجھنے کی صلاحیت کے بغیر مصلح بن بیٹھا ہو' یا پھر وہ مفسد ایسا کر سکتا ہے جس کی اصل نیت اس مقصد کو بدل دینے کی ہو جس کے لئے یہ اسکیم حکیم مطلق نے تجویز کی ہے"۔ (تفہیم القرآن' ج ۳- آیت ۲ حاشیہ ۲ جزوی نمبر(۴) ص ۳۲۴)۔

جامع اصلاحی اسکیم کے اسی تخیل کی تائید ص ۳۷۵ پر ہوتی ہے:

"..... دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس شہوانی ماحول کو بدل دینے کی کوئی صورت اس کے سوا نہ تھی کہ لوگوں کا ایک دوسرے کے گھروں میں بے تکلف آنا جانا بند کیا جائے' اجنبی عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کی دید سے اور آزادانہ میل جول سے روکا جائے' عورتوں کے ایک قریبی حلقے کے سوا غیر محرم رشتہ داروں اور اجنبیوں کے سامنے زینت کے ساتھ آنے سے منع کر دیا جائے' قحبہ گری کے پیشے کا قطعی انسداد کیا جائے' مردوں اور عورتوں کو زیادہ دیر تک مجرد نہ رہنے دیا جائے اور لونڈی غلاموں تک کے تجرد کا مداوا کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ عورتوں کی بے پردگی اور معاشرے میں بکثرت لوگوں کا مجرد رہنا اللہ تعالیٰ کے علم میں وہ بنیادی اسباب ہیں جن سے اجتماعی ماحول میں ایک غیر محسوس شہوانیت ہر وقت ساری و جاری رہتی ہے اور اسی شہوانیت کی بدولت لوگوں کی آنکھیں' ان کے کان' ان کی زبانیں' ان کے دل سب کے سب کسی واقعی یا خیالی فتنے (Scandal) میں پڑنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ اس خرابی کی اصلاح کے لئے اللہ تعالیٰ کی حکمت میں ان احکام سے زیادہ صحیح و مناسب اور مؤثر کوئی دوسری تدبیر نہ تھی' ورنہ وہ ان کے سوا کچھ دوسرے احکام دیتا۔

دوسری بات جو اس موقع پر سمجھ لینی چاہئے وہ یہ ہے کہ شریعتِ الٰہی کسی برائی کو محض حرام کر دینے یا اسے جرم قرار دے کر اس کی سزا مقرر کر دینے پر اکتفا نہیں کرتی' بلکہ وہ ان اسباب کا خاتمہ کر دینے کی بھی فکر کرتی ہے جو کسی شخص کو اس برائی میں مبتلا ہونے پر اکساتے ہوں' یا اس کے لئے مواقع بہم پہنچاتے ہوں' یا اس پر مجبور کرتے ہوں۔ نیز شریعت جرم کے ساتھ اسبابِ جرم'

محرکاتِ جرم اور وسائل و ذرائع جرم پر بھی پابندیاں لگاتی ہے، تاکہ آدمی کو جرم کی عین حد پر پہنچنے سے پہلے کافی فاصلے ہی پر روک دیا جائے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتی کہ لوگ ہر وقت جرم کی سرحدوں پر ٹہلتے رہیں اور روز پکڑے جائیں اور سزائیں پایا کریں۔ وہ صرف محتسب (Prosecuter) ہی نہیں، بلکہ ہمدرد، مصلح اور مددگار بھی ہے۔ اس لئے وہ تمام تعلیمی، اخلاقی اور معاشرتی تدابیر اس غرض کے لئے استعمال کرتی ہے کہ لوگوں کو برائیوں سے بچنے میں مدد دی جائے"۔
(تفہیم القرآن - ج ۳، سورۃ النور، آیت ۲۷ - حاشیہ "۲۳" ص ۳۷۵-۳۷۶)

کوئی شخص اگر قرآن سے متذکرہ بالا حکمتوں کو اخذ نہ کر سکا ہو تو اسے کسی اچھے استاد اور لٹریچر کی مدد سے قرآن کا مزید عرصے تک تلمیذ بننا چاہئے۔ تمام فقہی امور، تعبیرات نصوص اور دینی نظامِ آداب و اخلاق سے ان حکمتوں کا تعلق ہے۔ ممنوعات سے بچانے کے لئے جنگلے اور حد بندیاں اور نشانات لگانا ایک طرف اور انسدادِ جرائم کے لئے مثبت اور منفی دونوں طرح کے افکار، جذبات اور اخلاقیات کا اہتمام کرنا دوسری طرف، یہ اسلام کی نہایت ہی اصولی اور بنیادی حکمتیں ہیں۔ راقم نے دارالاسلام میں مولانا سید مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی دونوں کے دروسِ قرآن و حدیث سے یہ امورِ دین اخذ کئے ہیں، اور ذہن میں آج بھی تازہ ہیں۔ ان سے انجان کوئی شخص یا کنارہ کرنے والا ہرگز اس ذمہ داری کا مکلف نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو اصول و احکامِ شریعت اور آیات و احادیث کی تفسیریں اور تعبیریں سکھانے کے لئے مسند لگا لے۔ مولانا نے جامع اسکیم اور اسلام کے نظامِ اصلاح والے حکیمانہ طریقے کا آیت ۳۴ کے تحت حاشیہ نمبر ۶۰ میں ذکر کیا ہے اور یہی بات "پردہ" نامی کتاب میں بھی موجود ہے، بلکہ "پردہ" میں زیادہ جامعیت سے اسکیم بیان کی گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ چہرے کا پردہ ہو یا زینتوں کا اخفاء یا استیذان کا قانون ان سب کو اسلام کی متذکرہ بالا حکمت اور جامع اصلاحی اسکیم کے اندر رکھ کر پھر مفہوم کو متعین کرنا یا جانچنا چاہئے۔ ورنہ اگر چہرے کے پردے کا مسئلہ الگ سے ایک یونٹ کے طور پر لے لیا جائے تو اس کا وزن بڑا معمولی نظر آتا ہے۔ یوں ہو گیا تو کیا اور دوں ہو گیا تو کیا؟

قانونِ حجاب کے مضمرات

ادھر کی تمہیدی گفتگو اس لئے ضروری تھی کہ ایک صحت مند ذہن اور قلبِ سلیم کے لئے وہ معاون ہو جاتی ہے' احکامِ حجاب کو سمجھنے میں۔ یہاں ایک اور مسئلہ کا صرف ذکر کروں کہ یہ بڑی اہم اور مؤثر بحث ہے کہ احکامِ حجاب سورۃ النور (تفہیم ج ۳) اور سورۃ الاحزاب (تفہیم ج ۴) میں وقت کے ماحول (شانِ نزول) کے مطابق بیان ہوئے ہیں اور یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کہ النور پہلے نازل ہوئی یا الاحزاب۔ مختلف علمائے سلف اور ائمہ فقہاء نے مختلف رائیں قائم کی ہیں۔ مولانا مودودیؒ نے بھی بحث و نظر کے بعد اپنا ایک نقطۂ نظر اختیار کیا' مگر احکام کے متعلق انہوں نے بات کھلی چھوڑ دی ہے کہ دونوں میں سے جو بھی صورت اختیار کی جائے' کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ تاہم ذیل کے سلسلۂ آیات میں پردے کے بہت سے مقتضیات کو بیان کیا گیا ہے۔ میں یہاں سورۃ الاحزاب کی ان اہم آیات کو پیش کرتا ہوں جن پر مولانا نے کلام کیا ہے' اور جن کو مختلف لوگ بنائے بحث بناتے ہیں۔

> "نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو دبی زبان سے بات نہ کیا کرو کہ دل کی خرابی کا مبتلا کوئی شخص لالچ میں پڑ جائے' بلکہ صاف سیدھی بات کرو۔ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو' اور سابق دورِ جاہلیت کی سج دھج نہ دکھاتی پھرو۔ نماز قائم کرو' زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم اہلِ بیت نبیؐ سے گندگی کو دور کر دے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے۔ یاد رکھو اللہ کی آیات اور حکمت کی ان باتوں کو جو تمہارے گھروں میں سنائی جاتی ہیں۔ بے شک اللہ لطیف اور باخبر ہے۔" (آیات ۳۲-۳۴)

یوں تو ان آیات کے بارے میں بڑی بحثیں ہیں جن کا صاحبِ تفہیم القرآن نے نوٹس لیا ہے' مگر ہمیں جو مطالب جس حلقے تک پہنچانے ہیں' ہم اپنی توجہ ادھر ہی رکھیں گے۔ بعض حضرات نے ابتدائی مخاطبات (نبی کی بیویو!) کو سامنے رکھتے ہوئے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس آیت کا تعلق صرف نبیؐ کی ازواجِ مطہرات سے ہے لہٰذا "**وَقَرْنَ فِی بُیُوْتِکُنَّ**" (گھروں میں وقار سے رہو) کا مطالبہ صرف انہی سے ہے' بقیہ خواتینِ اسلام سے اس خطابِ مسلسل کا کوئی تعلق نہیں۔ اس مفہوم کے دلائل کو سامنے رکھتے ہوئے

ہم دکھاتے ہیں کہ نتائج غلط اخذ کئے گئے ہیں۔

یہ بات کہ تم "عام عورتوں" کی طرح نہیں ہو' اس کا اطلاق جملہ عرب سوسائٹی اور مدینہ میں رہنے والے غیر مسلم حلقوں کی عورتوں پر کیوں نہ سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب اصلاح کی بات کسی سے کہی جاتی ہے تو اس کا انداز یہی ہوتا ہے۔ مثلاً ایک باپ اپنے بچے کی تادیب کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ تم عام بچوں کی طرح نہیں ہو کہ دوسروں کو گالی دیتے پھرو۔ یہاں یہ مطلوب نہیں کہ عام بچوں کے لئے یہ حرکت جائز ہے' بلکہ یہ کہ ان میں سے خاصی تعداد میں رواج یافتہ ہے' یا کئی بچے اس کا احساس نہیں کرتے۔ یہاں بھی بات نبی ﷺ کی بیویوں سے کی جا رہی ہے مگر مدعا پورے معاشرے کی عورتوں کی اصلاح ہے۔ ورنہ یہ ماننا پڑے گا کہ دوسری مسلمان عورتوں کے لئے جائز ہے کہ وہ غیر مردوں سے (مِنْ وَّرَاءِ حِجَابٍ یا اس کے بغیر) دبی زبان سے باتیں کرنے میں آزاد ہیں اور ان کی لوچدار باتوں سے کسی ایسے شخص میں جو دل کی خرابی میں مبتلا ہو' کوئی ہوس یا تمنا پیدا ہی نہ ہو گی۔ وہ تو بس صرف نبی ﷺ کی ازواج (رضی اللہ عنہن) ہی کے متعلق ہو سکتی ہے۔ یہاں اللہ سے ڈرنے کا بھی ذکر ہے۔ یعنی نبی ﷺ کی بیویوں کو تو اللہ سے ڈرنا چاہئے اور عام عورتیں اس سے آزاد ہیں۔ نبیؐ کی بیویوں کو تو غیر مرد سے صاف سیدھی بات کرنی چاہئے' البتہ عام عورتیں چاہیں تو وہ خوبصورت اسلوب ادا اور دلکش آواز کے ساتھ لمبی چوڑی گفتگو کرتی رہا کریں۔ "گھروں میں وقار سے رہنے" کے حکم کو ازواج النبی ﷺ کے ساتھ خاص کرنے والے حضرات یہ بتائیں کہ عام عورتوں کے لئے آگے کا متصل حکم بھی لازم نہیں ہو گا جس میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ جاہلیت کی طرح بناؤ سنگھار نہ دکھاتی پھرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ یہ سب احکام جو مسلسل بیان ہو رہے ہیں کیا وہ مخاطبات اولیات ہی کے لئے خاص ہوں گے؟ پھر آگے اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کے گھر والوں کو اپنے احکام کا مقصد بتاتے ہوئے فرماتا ہے کہ میرا ارادہ ہے کہ تم سے گندگی کو دور کر کے تمہیں پاک صاف بنا دوں۔ تو کیا عام عورتوں کے متعلق خدا یہ نہیں چاہتا کہ ان سے گندگی دور ہو اور وہ پاک صاف زندگی گزاریں۔

آگے آیت ۳۵ پھر اپنے مفہوم کا رابطہ اسی پہلی آیت ۳۴ سے جوڑتی ہے۔ مسلمان

مردوں اور عورتوں کی خوبیاں بیان کر کے مغفرت اور اجرِ عظیم کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس آیت ۳۵ پر مولانا مودودی کا مختصر نوٹ یہ ہے:

"پچھلے پیراگراف کے بعد متصلاً یہ مضمون ارشاد فرما کر ایک لطیف اشارہ اس امر کی طرف کر دیا گیا ہے کہ ادھر ازواجِ مطہرات ؓ کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ ان کے لئے خاص نہیں ہیں بلکہ مسلم معاشرے کو بالعموم اپنے کردار کی اصلاح انہی ہدایات کے مطابق کرنی چاہئے"۔ (تفہیم - ج ۴ - سورۃ الاحزاب' آیت ۳۵' حاشیہ "۵۳" ص ۹۵)

بلکہ "وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ" والے جزوِ آیت میں صرف یاد کرنے ہی کا حکم نہیں ہے' بلکہ آپس میں بھی اور دوسروں کے سامنے بھی ان کو پڑھنا' سنانا' سمجھانا ان کی ذمہ داری ہے۔ اس گھر کو نمونے کا گھر بنا کر اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات (رضی اللہ عنہن) کو یہ ذمہ داری بھی سونپی کہ وہ عورتوں کے لئے معلمات کا بھی کام کریں اور مونہ پیش کرنے کا بھی۔ یہاں ازواجِ مطہرات کو (جنہیں خدا تعالیٰ تمام مسلمان خواتین کے لئے معلم اور نمونہ اور رہنما بنانا چاہتا ہے) اولین مخاطب بنا کر تمام مسلمان عورتوں کے سامنے مطلوبہ معیارآت رکھ دیئے گئے ہیں۔یہاں مولانا کا صرف ایک پرزور اقتباس "پردہ" سے لے کر پیش کیا جاتا ہے:

"ایک انسان کو دوسرے انسان کی جو چیز سب سے زیادہ متاثر کرتی ہے وہ اس کا چہرہ ہی تو ہے۔ انسان کی خلقی و پیدائشی زینت' یا دوسرے الفاظ میں انسانی حسن کا سب سے بڑا مظہر چہرہ ہے۔ جذبات کو سب سے زیادہ اپیل وہی کرتا ہے۔ صنفی جذب و انجذاب کا ایجنٹ بھی وہی ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے نفسیات کے کسی گہرے علم کی ضرورت نہیں۔ خود اپنے دل کو ٹٹولئے' اپنی آنکھوں سے فتویٰ طلب کیجئے' اپنے نفسی تجربات کا جائزہ لے کر دیکھ لیجئے۔ منافقت کی بات تو دوسری ہے' البتہ صداقت سے کام لیجئے گا تو آپ کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ صنفی تحریک (Sexual Appeal) میں جسم کی ساری زینتوں سے زیادہ حصہ اس فطری زینت کا ہے ... اگر مقصد اسی طوفان (یعنی مغربی تہذیب - راقم) کو روکنا ہو تو اس سے زیادہ خلافِ حکمت بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کو روکنے کے لئے چھوٹے چھوٹے دروازوں پر تو کنڈیاں چڑھائی جائیں' اور سب سے بڑے دروازے کو چوپٹ کھلا چھوڑ دیا جائے"۔

ایک مجتہدانہ رائے یہ سامنے آئی ہے کہ عورت کے چہرے کو کھلا رکھنے سے کوئی فتنہ نہیں پیدا ہوتا اور نہ قرآن میں کہیں یہ علت بیان کی گئی ہے۔ اور یہ کہ یہ لوگ چہرے کو اس لئے چھپانا چاہتے ہیں تاکہ کوئی غلط قسم کے خیالات اس کو دیکھ کر دل میں پیدا نہ ہوں۔ یہاں تو یہ شریف زادیوں کی پہچان کے لئے ہے ---- یعنی آواز سن کر تو غلط رجحانات پیدا ہو سکتے ہیں' زینت کو دیکھ کر بھی' مگر چہرہ دیکھ کر نہیں ہوتے۔ جناب مجتہد نے نفسیات کا مطالعہ اگر نہیں کیا' یا خود اپنے نفس کے تاثرات اور مدوجزر پر توجہ نہیں کی تو ان کو عربی زبان کے مطالعہ اور عربی شاعری میں کاوش کرتے ہوئے چہرے کے اثرات کو جان لینا چاہئے تھا۔ خود اردو ادب اور اردو شاعری میں نسوانی چہرے کے متعلق جو تعریفیں اور تشبیہیں اور استعارے رائج ہیں' ماہ رو اور لالہ رخ اور کتابی چہرہ' رخِ زیبا' رخِ انور وغیرہ سے آگے نکل کر ذرا ایسے اشعار جمع کر لیجئے جن میں پیشانی' بھنوؤں' پلکوں' آنکھوں' نظروں' رخساروں' ناک' ہونٹوں' ٹھوڑی اور چاہ ذقن' خال اور مسا' دانتوں اور لعابِ دہن کی تعریفیں پائی جاتی ہیں' پھر سرمہ' غازہ' بیندی' گلگونہ' مسی' پان کی لالی وغیرہ کی جو تفصیلات ادب میں جمع ہیں وہ عام انسانوں کے چہرے سے اثر پذیری کو ظاہر کرنے والی ہیں۔ پھر چہرے پر غصے کا اثر' پشیمانی کا اثر' اخفائے راز کا اثر' تبسم اور قہقہے کا اثر' مخفی تبسم جو آنکھوں سے جھلکتا ہے اس کا اثر' غمزہ و ناز و ادا اور ذہنی کشمکش کا اثر ہر جذبے کا کسی خاص حصے سے کسی رنگ کی شکل میں ظاہر ہونا' یہ ساری چیزیں چہرے کی پردے کی زیرِ بحث اہمیت کو واضح کرتی ہیں۔ اگر چہرہ صنفی تحریک کا باعث نہیں بنتا تو پھر تو پوری انسانی فطرت اور نفسیاتی اثر پذیری کے متعلق علوم و فنون سب کو بدلنا ہو گا۔ اگر بحث اجازت دیتی تو میں نثر و نظم کے کچھ اجزاء آپ کے سامنے رکھتا۔

ساتھ ہی یہ فرمانا کہ چہرہ کھلا رکھنے کے مخالفین کہتے ہیں کہ اس سے غلط قسم کے خیالات دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریر میں چند سطر آگے غضِ بصر کے متعلق یہ لکھا ہے کہ یہ تمہارے دلوں کے تزکئے کے لئے مفید ہو گا۔ یعنی چہرہ کھلا رہے' بس اسے دیکھا نہ جائے تو دل میں خراب خیالات پیدا نہ ہوں گے۔ وہی علت آپ نے یہاں بیان کر دی جسے دوسروں کی طرف سے سن کر اسے بے حقیقت قرار دیتے ہیں۔ آیاتِ پردہ میں "فَيَطْمَعَ الَّذِي فِي قَلْبِهِ مَرَضٌ" بھی مذکور ہے' یعنی دل میں کمزوری موجود

ہے اور غلط جذبات اکساہٹ کے کسی سبب سے متحرک ہو سکتے ہیں اور کوئی تمنا یا امید یا ہوس پیدا ہو سکتی ہے۔ یہی امکاناتِ تحریک کھلے چہرہ سے بھی متعلق ہیں۔ اسی طرح "اَزْکٰی لَکُمْ" اور "رجس" اور "تطہیر" کے الفاظ کیا ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ شارع کا مقصد مختلف احکامِ پردہ سے یہ ہے کہ معاشرے کو ان خرابیوں سے بچایا جائے۔ اس طرح کے تمام قرآنی اشارات کو درکنار رکھ کر بھی اجتہاد ہو سکتے ہیں یا مجتہد ان کی نفی کر سکتا ہے۔ سب سے دلچسپ لطیفہ یہ عجیب اجتہاد ہے جس میں ہمارے دوست کو ماضی سے لے کر اب تک کے علماء میں تفرد حاصل ہے کہ عورت جلباب کو چہرے کے متعلق جس شکل میں چاہے استعمال کرے 'لمبا پلو لٹکا لے' تھوڑا سا آگے بڑھا دے یا جو شکل بھی اسے پسند ہو یہ اس کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے۔ اگر اکثر احکامِ شریعت کو افراد کی آزاد مرضی و پسند پر چھوڑ دیا جائے' پھر تو دین میں یسر ہی یسر رہ جائے گا۔ غضِ بصر کا یہ عجیب استعمال ہے کہ عورتیں تو کھلے چہروں کے ساتھ پھریں' مرد البتہ نگاہیں نیچی رکھیں' عورتیں بھی نگاہیں نیچی رکھیں۔ ذرا کسی مخلوط اور تصویر پسند اور اباحت پسند سوسائٹی میں چل پھر کر دیکھئے کہ آپ کتنا غضِ بصر کر لیتے ہیں اور کتنے نقوش آپ کے ذہن میں رہ جاتے ہیں۔ خیالی اور شاعرانہ باتوں سے تو قرآن کی تفہیم نہیں ہو سکتی۔

مزید اجتہاد یہ کہ پردہ کے یہ (چہرہ ڈھانپنے والے) تصورات ہندو سوسائٹی سے آئے ہیں' تو اس کا علاج یہ ہے کہ ہندو سوسائٹی سے ربط کے دور سے پیچھے چلے جائیے اور دلائل وہاں سے لیجئے۔ دوسری طرف یہ بھی خیال رہے کہ ہندو تہذیب سے زیادہ قوت کے ساتھ مغربی مادہ پرستانہ اور جنسیت زدہ تہذیب ہم پر حملہ آور ہے۔ اس کے آنے کے بعد جس تیزی سے بول چال' رہن سہن' سازوسامان' زنجیر تعلقات مرد و زن اور قانونی حجاب ہمارے متاثر ہوئے ہیں' بلکہ درحقیقت بہت زیادہ میدان دشمن نے فتح کر لیا ہے' اس کے زہر سے آلودہ ذہن اگر نکاتِ شریعت میں نئے نئے رخ نکالیں گے تو وہ بہت زیادہ خطرناک ہوں گے۔ یہ فتنۂ تہذیبِ فرنگ' فتنۂ تاتار سے زیادہ سخت ہے۔ تاتاریوں نے تو جان و مال تباہ کئے تھے' یہ ہمارے عقیدوں' قدروں' حدود حلال و حرام' عائلی قوانین' نظامِ تعلیم اور تصورِ ثقافت کو برباد کر رہا ہے۔

آپ نے اس کے خلاف کیا نکتہ نکالا۔ عورتوں کو گھروں سے نکالنا' انہیں بے پردہ کرنا'

کھلے چہروں کے ساتھ مخلوط معاشرت کے ایوان میں لانا تو اس تہذیب کے اعلان کردہ' کتابوں میں شائع شدہ مطلوبات ہیں۔ آپ نے ان کا منشا پورا کر کے کون سا احسان قرآن اور ملت پر کیا۔ آپ کو تو اسلامی اقدار و احکام کا احیاء کرنا تھا' آپ مغربی کلچر کے شکنجے میں کہاں جا پھنسے۔

انہی کی محفل سنوارتا ہوں' چراغ میرا ہے' رات ان کی
انہی کے مطلب کی کہہ رہا ہوں' زبان میری ہے' بات ان کی

آخر دوسرے تمدنوں اور تہذیبی اثرات کے حملے کے باوجود قرآن و سنت تو جوں کے توں موجود ہیں' ان کے مفسرین اور محدثین اور فقہاء اور قاضی اور صوفی اپنی میراث میں اصل دینِ اسلام کی بحثیں چھوڑ گئے ہیں۔ ذرا یہ فرمایئے کہ جن بھی صحابہ یا علمائے سلف کی روایات صحیح یا تحقیقات بے آمیز کے ہاں سے چادر سے پورا جسم ڈھانکنے یا چہرہ چھپانے کے دلائل ملتے ہیں' ان پر ہندو سوسائٹی اور تہذیب کس طرح جا کے اثر انداز ہو گئی؟ اور میں نے بچشمِ خود ایسی چرواہیوں کو دو ایک بار سڑک سے کچھ فاصلے پر اپنا ریوڑ سنبھالتے سعودی عرب میں دیکھا جو سر سے پاؤں تک برقعہ میں تھیں اور اپنا فرض ادا کر رہی تھیں۔ کیا وہاں بھی ہندو سوسائٹی نے جا کر تبلیغ کی اور عورتوں اور لڑکیوں کو سکھا دیا کہ اس طرح پردہ کرنا ہے۔ نصف صدی پہلے کا سفرنامۂ حج جس کی سعادت قاری حکیم محمد حمیدالدین سنبھلیؒ کو حاصل ہوئی' ان کی عبارت ملاحظہ فرمایئے۔ یہ ۱۹۳۴ء کی بات ہے۔

"تمام بدن پر (بجائے کپڑے کے) اس کی دھجیاں (ہوتیں) یعنی برہنہ پا یا مثل برہنہ کے' لیکن جوان عورتیں' نقاب و برقع میں ضرور ہوتیں' گو کہ کیسا ہی خستہ و بوسیدہ نقاب و برقعہ ہوتا (اور چہرہ اس طرح چھپا ہوتا کہ) ہم نے کسی جوان العمر عورت کی کہیں شکل نہیں دیکھی"۔ (نصف صدی قبل کا سفرنامۂ حج' ص ۷۸-۷۹)

کیا کانگریس یا ہندو مہاسبھا نے وہاں کوئی کالج یا قرآنی مدرسہ کھلوا رکھا تھا' یا اپنے تبلیغی وفود بھیج کر انہوں نے وہاں چہرہ چھپانے والا پردہ رائج کیا؟ آخر کوئی بے تکی بات کر دینے سے فائدہ؟

عورتیں اور کھلے چہرہ کے ساتھ اقامتِ دین کا کام

ایک اور دوست ہیں جو اس غم میں گھلے جا رہے ہیں کہ جو مذہب پسند عورتیں کھلے چہرے کے ساتھ پائی جاتی ہیں ان سب کو اقامتِ دین کی خدمت کے لئے پورا پردہ کرنے والی خواتین کے ساتھ جمع کیوں نہ کر دیا جائے۔ اگلا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ دوسرے طرح کے فسق و فجور کے ساتھ جو مرد مذہب پسند بھی ہیں ان کو بھی کیوں نہ صفِ اربابِ حق میں لے لیا جائے۔ بلکہ اور آگے بڑھئے' ایک شخص سمگلر ہے یا قمار باز ہے' یا رشوت کا لین دین کرتا ہے یا سود خور ہے' مگر وہ دینی جذبہ بھی رکھتا ہے تو کیوں نہ اس کو بھی ساتھ لے لیا جائے۔ یعنی اب ان لوگوں کا فقدان ہو گیا ہے جنہیں دعوت دے کر اور ان پر کام کر کے ان کو دین کی کم سے کم لازمی پابندیوں کے اختیار کرنے تک لے آیا جائے۔ اقامتِ دین کی اصل دعوت دینے والوں کو تو ایک معیار قائم رکھنا تھا' تعداد چاہے کتنی کم رفتار سے بڑھے' مگر اب اقامتِ دین کی جگہ چونکہ انتخاب (جو ایک ذریعۂ کار تھا) اب خود ایک پوری توجہ چاہنے والا مقصد (برائے اقامتِ دین) بن گیا ہے' لہٰذا اب تو اصل چیز انتخاب جیتنا اور زیادہ سے زیادہ ووٹروں کو ساتھ لگانا ہے جس کے لئے معیار کو آہستہ آہستہ نیچے کر کے آخر کار سب لوگوں کو جمع کر لینا ہے۔ مگر عملاً اس خواب کا پورا ہونا آسان نہیں۔ بے پردہ عورتیں چونکہ کثرت سے ہیں اور ان کو ایسی طویل اور جاں گسل محنت نہیں کرنی ہے جیسی اب تک دین کی راہ میں پابند پردہ خواتین کرتی رہی ہیں' لہٰذا ان کی خوب کثیر تعداد بھرتی ہو سکے گی اور وہ آہستہ آہستہ پردہ دار چہروں والی خواتین کو پیچھے پھینک کر آئندہ اصل قوت ہوں گی' مگر پھر ہماری وہ سعی ختم ہو جائے گی جو ہم مغربی تہذیب کی یورش کے خلاف چہروں کے پردے کے لئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے کر رہے تھے۔ پھر تو اقامتِ دین کے لئے ایسی ہی عورتیں اور ایسے ہی مرد بھرتی ہوں گے اور یہی ووٹر اور نمائندے بن کر اسلام کو جاری کریں گے۔ سبحان اللہ والحمد۔ اقامتِ دین کا انتہائی کٹھن کام اور اس کے لئے کارکنوں' ارکان' ووٹروں اور نمائندوں کے گرتے ہوئے معیارات' یہ اس دور کی ترقی یافتہ عقل ہے اور یہ اقامتِ دین کے قافلہ سالاروں کا عملی پیمانہ ہے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ بھئی اگر ذہنوں میں کجی نہیں تو بے پردہ عورتوں یا بے نماز مردوں کی صف الگ بنائیے جو متقین سے بھی مختلف درجے پر ہو' یعنی حامیانِ

جماعت۔ ان کی تنظیم الگ کیجئے اور ان کی لیڈر شپ کا کوئی مناسب انتظام سوچئے۔ لیکن چشمے کے صاف پانی میں جوہڑ کا میلا پانی نہ ملایئے۔ زمزم میں گنگا جل کی آمیزش نہ کیجئے۔ ورنہ اس تبدیلی کو بعد میں اس کے اثرات بد دیکھ کر بھی لوٹایا نہ جا سکے گا۔ معاملہ شاید کچھ ایسا ہے کہ گندم اگر بہم نہ رسد بھس غنیمت است! براہِ کرم گندم تھوڑی سی بھی ہو تو اسے الگ بوریوں یا کھتوں میں رکھئے اور بھس کے انبار یا ڈھیر جدا رکھئے۔ دونوں کو یکجا نہ کیجئے اور یکجا کر کے یہ دعویٰ نہ کیجئے کہ ہم گندم مہیا کرتے ہیں۔

ذرا آپ تجزیہ کر کے یہ بھی تو فرمایئے کہ جدید سامراجی قوتوں کی مسلط کردہ تہذیب اور مادہ پرستانہ کلچر اور خالص حیوانی نظریۂ جنس نے بھی کوئی اثرات ہمارے معاشرے پر' ہماری ذہنی قوتوں پر' ہمارے علوم پر' ہمارے تصورِ مذہب پر' ہمارے نظریۂ نسائیت پر اور ہمارے قانونِ حجاب پر ڈالا ہے یا نہیں؟ آرٹ اور شاعری اور ادب اور دینی لیڈروں کے خیالاتِ حاضرہ اور ترقی پسند. مفتیوں کے فتووں کے رنگ ڈھنگ' یہ سب کچھ آپ کو دعوت دے رہا ہے کہ ہندو سوسائٹی یا تمدن کی لکیر پیٹنے کے بجائے اب گلے میں لپٹنے والے نئے زندہ سانپ کا جائزہ لیجئے اور اس نے ہمارے سوچنے والے دماغ اور دینی مزاج کو جہاں جہاں سے مجروح کیا ہے' اس پر تبصرہ فرمایئے اور علاج تجویز کیجئے۔ کچھ لوگ مسلط شدہ طوفان کی پیدا کردہ تحریفات اور کجرویوں کی بڑھتی ہوئی رو کو روکنے کے لئے ہندو سوسائٹی کے ربط سے پہلے کے نصوص و تعبیرات کی روشنی میں اعترافی اجتہادات کے روز افزوں سنپولیوں کو کچلنے میں لگے ہیں' اور آپ کو فکر پڑی ہے ہندو سوسائٹی کے اثرات کی۔

پچھلے طوفانوں نے جو کچھ بگاڑا' نیا طوفان تو آنکھوں کے سامنے ہماری معاشرت اور عائلی نظام اور تصورِ نسائیت کو بگاڑ رہا ہے اور یہ بگاڑ نہایت زور سے بڑھتا جاتا ہے' اور نئے نئے لوگوں اور خاندانوں کو شکار بنا رہا ہے۔ اس کے جراثیم کا مقابلہ پرانے علماء نے پھر بھی خوب ڈٹ کے کیا' چاہے کچھ دوسری کمزوریاں ان کی سوچ بچار پر اثر انداز ہوئی ہوں' لیکن نئے روشن خیال اور نوجوان مولوی نے تو ان کا سرے سے نوٹس لینا اور کسی معاملے میں عہدِ حاضر کی مخالف اسلام بوچھاڑوں کی روک تھام کا کام بالکل چھوڑ دیا ہے۔ وہ باہر کے طوفانِ مسلط کے خلاف لڑنے کے بجائے اپنے ہی دینی حلقوں سے چھیڑ چھاڑ کر

(باقی صفحہ ۴۲ پر)

یہودی سرمایہ دار--پاکستان کے لئے ایک عظیم خطرہ

جناب امیر محترم۔

السلام علیکم۔ میں آپ کی توجہ موجودہ دور میں پیدا ہونے والے ایک نہایت اہم مسئلے کی طرف دلانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ سود جیسی لعنت کے پھیلنے کے امکانات قوی سے قوی تر ہوتے جارہے ہیں۔ آجکل امریکہ' برطانیہ' جاپان' جرمنی جیسے ممالک کے بڑے بڑے سرمایہ دار آپس میں متحد ہو کر MULTI-NATIONAL کارپوریشنوں کو تشکیل دینے میں مشغول ہیں اور انکے پیچھے یہودی سرمایہ دار بڑے پیمانے پر سرمایہ لگا رہے ہیں۔ بالخصوص تیسری دنیا کے ملکوں میں جن میں پاکستان نواز شریف صاحب کی سکیموں کی وجہ سے سرفہرست ہے' بڑے بڑے کارخانے' سڑکیں' پل بنا کر اور ٹیلی فون لگا کر زیادہ سے زیادہ منافع کما کر اپنے اپنے ملکوں کو پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ دنیا کی تجارت پر اتنا کنٹرول حاصل کرتے جارہے ہیں کہ ان کے دیئے ہوئے قرضوں کے سامنے بڑی بڑی حکومتیں اپنے آپ کو بے بس پاتی ہیں۔ اس سرمایہ کاری کی وجہ سے ہمارے ملک کے بہت سے حساس ادارے ان بین الاقوامی ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کی ملکیت میں چلے جائیں گے۔ اس طرح ملک کے اندر بیرونی سرمایہ کاروں کا اثر و رسوخ اس حد تک بڑھ جانے کا امکان ہے کہ ریاست کے اندر ریاستوں کے قیام کا گمان پیدا ہونا شروع ہو جائے گا۔ اس سرمائے کے ساتھ ساتھ مغربی کلچر فروغ پاتا چلا جائے گا۔ بعد ازاں مغربی تہذیب کی قباحتوں سے پیچھا چھڑانا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ ضروری اشیاء کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ ان سرمایہ داروں کی مرضی پر منحصر ہو گا۔ یہودی سرمایہ داروں کی کارپوریشنیں کسی وقت اتنی قوت اختیار کر سکتی ہیں کہ وہ اپنے حقوق کے تحفظ کے لئے ہماری حکومت سے اپنی فوج' اپنی پولیس اور اپنا قانون اور جاسوسی نظام بھی قائم کرنے کا مطالبہ کرنے لگیں۔ اس طرح ہمارے ملک کا حال ایک ایسے نادار شخص کی طرح ہو جائے جو کھانے پینے کی اشیاء کے لئے اپنے گھر کا سامان یا زیورات بیچنے پر مجبور ہو جائے۔

خاکسار
محمد اسلم قاضی
7/1 یونین پارک سمن آباد لاہور

"یہودی ہمارے اداروں کو تباہ کردیں گے!"

سابق امریکی صدر بنجمن فرینکلن کی دہائی

جس سے ڈاکٹر اسلم قاضی کے موقف کو تقویت ملتی ہے

"ریاست ہائے متحدہ امریکہ عظیم خطرے سے دوچار ہے۔ یہ عظیم خطرہ یہودی برادری ہے۔ یہودی جہاں بھی گئے' اخلاق کی سطح پست ہوگئی اور کاروباری دیانت معدوم ہوگئی۔ یہ لوگ بالکل الگ تھلگ اجنبیوں کی طرح رہتے ہیں اور اندرون خانہ اپنی الگ ریاست قائم کرلیتے ہیں۔ جب انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ معاشی طور پر اس قوم کا گلا دبا دیتے ہیں۔ پرتگال اور سپین کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اپنی اس بدنصیبی کا ماتم کرتے ہوئے انہیں سترہ سو سال سے زیادہ ہوگئے ہیں کہ انہیں اپنے دیس سے نکلنا پڑا تھا۔ لیکن اگر انہیں فلسطین واپس دلوادیا گیا اور ان کی جائیدادیں بھی انہیں لوٹا دی گئیں' یہ کوئی نہ کوئی بہانہ تراش لیں گے اور یہیں گھسے رہیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ دوسروں کا خون چوسنا ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ اس لئے یہ اکیلے رہ نہیں سکتے۔ ان کا ایسے لوگوں میں رہنا مجبوری ہے جو ان کی نسل سے نہ ہوں۔

اگر انہیں امریکہ سے سو سال کے اندر نکال نہ دیا گیا تو نہ ہمارے جان و مال محفوظ رہیں گے نہ آزادی۔ جو ملک ہم نے اپنے خون کی قربانی دے کر قائم کیا ہے یہ لوگ اس کی شکل ہی بدل کر رکھ دیں گے اور الٹا ہمارے اوپر حکمران بن کر بیٹھ جائیں گے۔ اور اگر یہ لوگ دو سو سال تک یہاں رہ گئے تو ہماری آئندہ نسل ان کی غلام ہوگی جو ان کی خاطر کام پر لگی ہوگی اور یہ بیٹھ کر کھا رہے ہوں گے۔

میری بات کان کھول کر سن لو! اگر تم نے انہیں یہاں سے نکالنے میں سستی برتی تو آئندہ آنے والی نسلیں تمہیں تمہاری قبروں میں بھی معاف نہیں کریں گی۔ ان کی دس نسلیں بھی ہمارے ساتھ بیت جائیں لیکن یہ اپنے کرتوتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ چیتا جہاں گھس جائے وہاں سے نہیں نکلتا۔ یہودی اس سرزمین پر خطرہ ہیں۔ یہ ہمارے اداروں کو تباہ کردیں گے۔ انہیں دستور کے ذریعے یہاں سے بے دخل کردیجئے۔"

(1769ء کے دستوری کنونشن میں یہودیوں کے داخلے کے بارے میں "بنجمن فرینکلن" کی تقریر کا اقتباس)

عالمی امن کے قیام کا واحد راستہ

جدہ سے جناب اعزاز مسرور کا مراسلہ

مندرجہ بالا عنوان کے تحت ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے بجا طور پر ایسی مشترک اقدار تلاش کرنے کی کوشش کی ہے جن کی لڑی میں پوری انسانیت کو پرویا جاسکے۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال صحیح ہے کہ عالمی امن کے قیام کا یہی ایک راستہ ہے۔ انہوں نے سورۃ الحجرات کی روشنی میں دو مشترک قدروں کی نشان دہی کی ہے یعنی ایک وحدتِ خالق اور دوسری وحدتِ آدم۔

کلامِ الٰہی میں ایک ایسی آیت بھی ہے جو قدرِ مشترک ہی کو واضح کرتی ہے بلکہ ہمارے موضوع سے اتنا کامل تعلق اور مطابقت رکھتی ہے گویا ہمارے ہی سوال کا بین جواب ہو۔ یہ سورۂ آلِ عمران کی ۶۴ ویں آیت ہے:

"تو کہو اے اہلِ کتاب! آؤ ایک بات کی طرف جو برابر ہے ہم میں اور تم میں ____ کہ بندگی نہ کریں ہم مگر اللہ کی اور شریک نہ ٹھہراویں اس کو کسی کا اور نہ بنائے کوئی کسی کو رب سوائے اللہ کے ____ پھر اگر وہ قبول نہ کریں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو مسلمون ہیں۔"

عالمی امن کے قیام کے لئے یہ آیت ہمیں بہترین لائحہ عمل کا حکم دیتی ہے، خصوصاً آج کل کے عالمی حالات میں صرف اہلِ کتاب ہی کو خطاب کرنا کافی ہے کیونکہ کمیونسٹ روس کا شیرازہ بکھرنے کے بعد امریکہ ہی سپرپاور کے طور پر باقی رہ گیا ہے۔ امام خمینی نے گورباچوف کو دعوتِ اسلام دیکر بہت اچھی اور جرأت مندانہ کوشش کر دیکھی تھی مگر اب اسلام نہیں تو عالمی امن ہی کے لئے صرف امریکہ کو آمادہ و مائل کرنا ضروری ہے۔

یہ کام صدر امریکہ کو محض خط لکھ دینے سے یا اقوامِ متحدہ کی جنرل کونسل میں تقریر کرنے سے پورا نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلے ہمیں وہ غلط فہمی دور کرنی چاہئے جو مغربی دنیا اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں بڑے شدومد سے پھیلا رہی ہے۔ بہت منظم منصوبوں اور پروپیگنڈا کے ساتھ یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ اسلام سلامتی کا نہیں تشدد کا راستہ ہے۔ جو

اسلام پر عمل کرتا ہے وہ دہشت گرد ہے اور جو جتنا زیادہ عمل کرتا ہے اتنا زیادہ دہشت گرد ہے۔ بنیاد پرستی کی اصطلاح بھی اسی مقصد کے لئے گھڑی گئی ہے۔ ثبوت کے طور پر ان تحریکوں کا حوالہ دیا جاتا ہے جن کے نام اسلامی ہیں مثلاً حزب اسلامی یا جہاد یا الاخوان المسلمون وغیرہ اور جن کے ارکان شعائر اسلام کے پابند ہیں مگر جو اپنی آزادی کے لئے ہتھیار اٹھانے پر مجبور کردیئے گئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مغربی اقوام کو باور کرایا جائے کہ ان تحریکوں نے تشدد کی راہ اس لئے نہیں اپنائی کہ اسلام ایک تشدد پسند یا دہشت پسند مذہب ہے بلکہ ان کے تشدد کی وجہ اور بنیادی وجہ ان کے ساتھ کیا گیا ظلم ہے۔ لہٰذا بنیاد پرستوں کو ختم کرنے کی بجائے یہ بنیادی وجہ دور کرنی چاہئے۔ ان کو پرامن طریقے سے حق و انصاف دے دیا جائے تو تشدد خود بخود ختم ہوجائے گا۔ اسی طرح اس بات کی بھی سخت ضرورت ہے کہ ان تحریکوں کے قائدین کو اپنا رویہ بدلنے پر مجبور کیا جائے۔ اپنے حق کے لئے لڑنا اور جنگ کرنا اسلام ہی نہیں دیگر مذاہب میں بھی جائز ہے لیکن اسلام ہرگز یہ اجازت نہیں دیتا کہ اپنے جائز حق کی جنگ میں آپ دشمن کے بچوں کو موت کے گھاٹ اتاریں' بسوں کو آگ لگاکر قتل و غارت کریں یا طیارے اغوا کرکے بے قصور مسافروں کی جان لیں یا دشمن کے عام شہریوں کو یرغمال بنائیں۔ مانا کہ مظلوم کا اوچھے ہتھیاروں پر اتر آنا ایک طبعی امر ہے لیکن غصے اور انتقام میں پاگل ہونے کی تعلیم کم از کم اسلام میں ہمیں نہیں ملتی اور نہ قرآن و سنت سے ایسی حرکتوں کا جواز ثابت کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں اپنے عمل سے ثابت کرنا چاہئے کہ ایسی مذموم کارروائیاں بوسنیا میں عیسائیوں اور کشمیر میں بھارتی فوجیوں کا وطیرہ تو ہوسکتی ہیں مگر کٹر مسلمانوں کا شیوہ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ اخلاق کی حدوں کو کسی بھی حال میں پھلانگ جائیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسلام پسند تحریکیں اگر اسلام کے اخلاقی اصولوں پر عمل کریں تو نہ صرف اسلام کے متعلق دہشت گردی کا غلط الزام ختم ہوجائے گا بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے کامیاب و سرخرو بھی فرما دیں گے۔ یقیناً بے گناہوں کے خون سے رحمتِ خداوندی کو جوش نہیں دلایا جاسکتا۔ ایسی کارروائیوں نے آزادی پسند یا مذہب پسند تحریکوں کو کبھی کامیابی سے ہمکنار نہیں کیا۔ اس کے برعکس ان حرکتوں سے مخالف حکومتوں کو سختی کرنے کا جواز ضرور مہیا ہوتا رہا ہے۔ مصر' الجزائر اور مقبوضہ فلسطین میں آئے دن اس کا مشاہدہ

ہو رہا ہے۔

غیر مسلم اقوام بہت ہوشیار اور چالاک ہیں۔ چانکیہ اور میکیاولی کی طرز پر بظاہر اچھے اصولوں کا پرچار کرتی ہیں مگر درپردہ انہی اصولوں کو پامال بھی کرتی رہتی ہیں۔ بے شک یہ منافقت ہے اور اس کی مخالفت کرنا چاہئے لیکن ہمارے علماءِ کرام اور مولوی صاحبان' اِلّا ماشاء اللہ' اس مخالفت برائے مخالفت میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے اصولوں کی طرف داری بھی ترک کر دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان میں حق و باطل کی تمیز ہی باقی نہیں رہی۔ اس رویہ کی بہترین مثال عراق اور کویت کی جنگ کے دوران سامنے آئی۔ امریکہ کی بہت سی پالیسیوں کی مذمت یقیناً روا ہے لیکن صدام حسین جیسے آمر' جابر اور غاصب کو اس کے پرلے درجے کے احمقانہ اقدامات کے باوجود صلاح الدین ایوبی ثانی قرار دینا سیاسی اور فوجی ہی نہیں مذہبی طور پر بھی کور علمی کی دلیل ہے۔ عالمی امن قائم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ جارح کو سزا دی جائے۔ اگر اس اصول کے تحت امریکہ نے عراق پر چڑھائی کردی تو یہ بڑا سنہری موقعہ تھا کہ اس اصول کی پرزور عملی حمایت کی جاتی' اور اس اصول کا ڈھنڈورہ اتنے زور و شور اور تواتر سے پیٹا جاتا کہ اقوامِ متحدہ اور امریکہ کو آئندہ بھی اس اصول سے روگردانی نہایت مشکل ہوجاتی۔ صد افسوس کہ جن قوموں کو اس اصول کی اشد ضرورت تھی عین انہی قوموں نے اس وقت عراق کی حمایت کردی۔ نتیجہ ظاہر ہے اب بوسنیا میں سرب فوجیں ظلم و جارحیت بپا کئے ہوئے ہیں۔ امریکہ اور مغربی اقوام اپنے ہی اصول کا جنازہ اٹھتے دیکھ رہی ہیں کیونکہ مسلمانوں کو بچانے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں اور مسلمان ملکوں کی صدائے احتجاج بالکل بے اثر ثابت ہوئی ہے۔ جارح کو سزا دینے کا اصول اگر صحیح وقت پر نہ صرف تسلیم کرلیا جاتا بلکہ مسلّمہ طور پر بین الاقوامی قانون کی حیثیت میں منوا لیا جاتا تو آج صدائے احتجاج ثمر آور بھی ہوسکتی تھی۔

اسی طرح انسانی بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کی آڑ میں ہم سے زیادتیاں کی جاتی ہیں اور ہمیں ان زیادتیوں پر غم و غصہ کے اظہار کا حق ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم بنیادی حقوق کی پامالی کو جاری رکھیں اور زیادتیوں کا جواز مہیا کرتے رہیں۔ حق و انصاف کا بول بالا کرنا ہمارا اسلامی فرض ہے۔ ہمیں اپنے اخلاقی اعمال درست کرنے ہوں

گے' تبھی اسلامی تشخص کا صحیح امیج ابھرے گا۔ فرقہ واریت' نسلی اور صوبائی اور لسانی تعصب' جان و مال و آبرو کو سرِعام روندنا' کروڑوں کے قرضے ہضم کرنا' رشوت' ناجائز سفارش' میرٹ کا خاتمہ' جھوٹ' غبن' منافقت' ہارس ٹریڈنگ' اوروں کا حق چھیننا ہماری زندگی کے ہر شعبے اور ہر مرحلے میں سرایت کرچکا ہے۔ یہ سب اخلاقی جرائم ہیں۔ ان کا قلع قمع کئے بغیر ہم اقوامِ عالم کو نہ دعوتِ اسلام دے سکتے ہیں اور نہ دعوت امنِ عالم' اور نہ مشترکہ اقدار کی تلاش سودمند ہوسکتی ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں اپنے انفرادی اور اجتماعی اخلاق و کردار کو سنوارنے کے بعد ہی ہم اس مقام پر پہنچ سکتے ہیں جہاں سے دوسری اقوام کو سورۃ الحجرات کی ۴۹ ویں آیت کے مطابق دعوت گفت و شنید دیں اور وحدت خالق کی مشترک بنیاد پر باہمی تعلقات اور امنِ عالم استوار کریں۔ مجھے یقین واثق ہے کہ اگر امتِ مسلمہ اسلام کی صحیح اور اعلیٰ اخلاقی اقدار پر عمل شروع کردے تو امت مسلمہ اخلاقی بنیادوں پر متحد ہوکر جسدِ واحد بن جائے گی اور اتحاد بین المسلمین اور مسلم کامن ویلتھ کا خواب پورا ہوجائے گا۔ اگر چار دانگ عالم میں یہ تاثر قائم ہوجائے کہ مسلمان کی نشانی ہی یہ ہے کہ اس کا اخلاق بلند ہوتا ہے' جو شخص اخلاق اور حق و انصاف اور راستی سے گرا ہوا ہے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا تو پھر ان شاء اللہ اسلام خود بخود پھیلتا چلا جائے گا اور امنِ عالم یقینی ہوتا چلا جائے گا۔ ہمارا اخلاق مثالی ہوجائے تو اللہ تعالیٰ غلبۂ دینِ حق کے اسباب ایسے طریقوں سے پیدا فرما دیں گے کہ سب حیران رہ جائیں۔ کیا عجب امریکہ میں دین اسلام مقبول ہوجائے' یورپ مغلوب ہوجائے' کروڑوں شودر مسلمان ہوجائیں اور چین کی پوری قوم ہی اجتماعی طور پر دائرۂ اسلام میں داخل ہوجائے۔

اخلاقی اعمال کی درستی کے بعد بھی ہماری دعوتِ حق پر اگر اہلِ کتاب کان نہ دھریں تو مذکورہ آیت کے مطابق ہم صرف یہ کہیں گے کہ گواہ رہو ہم تو مسلمون ہیں۔ یعنی تم مانو یا نہ مانو' ہم اپنا اسلامی تشخص اور اخلاق و کردار قائم و دائم رکھیں گے۔

متحدہ عرب امارات میں
تنظیمِ اسلامی کے زیرِ اہتمام ریفریشر کورس
اور امیرِ تنظیم کے مختصر دورے کی رپورٹ

جیسا کہ ماہ فروری ۹۳ء میں کل اماراتی سطح پر منعقدہ تربیت گاہ میں اعلان کیا گیا تھا' امیر محترم امریکہ کے دورے سے واپس آتے ہوئے ۱۶ مارچ ۹۳ء کو عمرہ ادا کرنے کے بعد جدہ سے دبئی تشریف لائے۔ امیر محترم کی تشریف آوری سے قبل دیگر پروگرام تقریباً تکمیل پذیر ہو چکے تھے

محولہ بالا پروگرام دراصل اسی تربیتی عمل کا حصہ تھا جو کہ پاکستان میں شروع ہے اور اس سے قبل کراچی میں منعقد ہو چکا تھا۔ اس پروگرام کو Conduct کرنے کے لئے پاکستان سے جناب عبدالرزاق صاحب (ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان) اور جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب (ناظم تربیت تنظیم اسلامی پاکستان) ۱۰ مارچ ۹۳ء کو بدھ اور جمعرات کی درمیانی شب تشریف لائے۔ ایئرپورٹ پر بوجوہ تاخیر کے باعث رات کے ڈیڑھ بج گئے تھے۔ آپ حضرات کے استقبال کے لئے غالباً ۸ افراد ہوائی مستقر پر موجود تھے۔ بہت سے ساتھیوں کے لئے جناب عبدالرزاق صاحب "نئے" تھے اور جناب عبدالرزاق صاحب کے لئے سب کچھ نیا تھا کہ یہ ان کا پہلا دورۂ امارات تھا۔

۱۱ مارچ ۹۳ء بروز جمعرات

آج پروگرام کا باقاعدہ آغاز ہوا جو کہ پہلے ہی اعلان کیا گیا تھا اور اس طرح ابوظہبی' العین' دبئی اور راس الخیمہ کے رفقاء پروگرام شروع ہونے سے قبل شارجہ مرکز پہنچ گئے تھے۔ بوقت دس بجے رات شارجہ مرکز میں حلقہ امارات کی طرف سے جناب محمد خالد صاحب (ناظم حلقہ امارات) نے مہمان حضرات کے لئے استقبالی کلمات کے ساتھ ساتھ پروگرام کی نشست کی ترتیب سے بھی شرکاء کو آگاہ کیا۔ پہلا خطاب جناب عبدالخالق صاحب کا تھا۔ آپ نے اس ریفریشر کورس پر بحیثیت مجموعی روشنی ڈالی اور رفقاء کو اس کے پس منظر اور مقصد سے آگاہ کیا۔ آپ نے رفقاء پر مقصد کی اہمیت کے واضح ہونے اور اقامت دین کے نصب العین کے تذکرہ اور یاد دہانی کی ضرورت بھی بیان کی اور اس طرح کی تربیت گاہ کے مفید ہونے کا ذکر کیا۔ اس دوران آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس سلسلہ میں امارات کی کارکردگی قابل تعریف ہے۔ پھر چند

کلمات تعریف میں ادا کئے اس نے یقیناً امارات کے رفقاء کی حوصلہ افزائی کی۔ آپ نے دوران گفتگو اس پروگرام کی اس خاص جہت کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا کہ اس میں زیادہ زور نظریاتی تربیت پر ہے کیونکہ "مضبوط نظریہ اچھے عمل کا ذریعہ ہوتا ہے"۔ آپ کے خطاب کے بعد العین سے مزید رفقاء تشریف لائے اور الحمدللہ شرکاء کی تعداد تقریباً ۹۰ ہوگئی۔

اس مختصر خطاب کے بعد جناب عبدالخالق صاحب نے سورۃ الشوریٰ سے چند منتخب آیات کا درس دیا۔ ان آیات کے حوالہ سے آپ نے اقامت دین کا کام کرنے والے افراد کے اوصاف بیان کئے کہ ایسے اشخاص کو: (۱) اقدار کو تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ دنیا اور دنیا داری کے بارے میں اپنے افکار و خیالات میں تبدیلی لانا ضروری ہوتا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی حیثیت بہت معمولی ہے۔ (۲) توکل علی اللہ کی روش اختیار کرنا ہوتی ہے۔ (۳) کبیرہ گناہوں سے مجتنب رہنا ہوتا ہے۔ (۴) غصے پر قابو پاتے ہیں (۵) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی پکار پر لبیک کہتے ہیں۔ (۶) اجتماعی نظم کے تحت اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام کرتے ہیں۔ (۷) اپنے معاملات باہمی مشورے سے انجام دیتے ہیں۔ (۸) انفاق فی سبیل اللہ کرتے ہیں (۹) زیادتی ہونے کی صورت میں انتقام لیتے ہیں (بے غیرت نہیں ہوتے) (۱۰) فریق مخالف کی اصلاح کی غرض سے معاف بھی کرتے ہیں -------ان نکات کی عدم موجودگی میں اقامت دین کا کارکن کامیاب نہیں ہوتا۔ لہٰذا ہر کارکن کو غور و خوض کرنا چاہئے اور اپنے اندر پائی گئی خامیوں کو دور کرنا چاہئے۔ ۵۰-۱۱ پر درس قرآن کے اختتام کے ساتھ وقفہ ہوا جس میں شرکاء نے چائے پی اور قدرے تازہ دم ہونے کی سعی کی۔

۲۰-۱۲ پر (آدھ گھنٹہ کے بعد) جناب عبدالرزاق صاحب نے خطاب شروع کیا۔ آپ کا خطاب زیادہ تر DEMONSTRATIONS پر مشتمل تھا۔ آپ نے ڈایا گرام کی مدد سے تنظیمی ڈھانچے کی وضاحت کی' تنظیم کا پس منظر پیش کیا اور اس کی دعوت کا مرکزی نقطہ "دعوت رجوع الی القرآن" کو قرار دیا۔ آپ نے بتایا مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور مارچ ۷۲ء میں قائم ہوئی۔ اب تک قرآن اکیڈمی کی عمارات کے علاوہ کراچی اور ملتان میں مکمل ہو چکی ہیں اور فیصل آباد اور پشاور میں بھی بہت کام ہوچکا ہے۔ خدام القرآن کی ایک شاخ حیدر آباد (بھارت) میں کام کررہی ہے اور ایک نظم امریکہ میںSociety Of Servents Of Quran کے نام سے قائم اور مصروف عمل ہے۔ انجمن خدام القرآن نے دورہ ہائے ترجمہ قرآن کا جو سلسلہ شروع کیا اس کی مثال دنیا میں ناپید ہے۔ پھر اس کو آڈیو / ویڈیو کیسٹس کے ذریعہ دنیا بھر میں پھیلایا گیا ہے۔ ہندوستانی بھائیوں نے نہایت عالی حوصلگی کا ثبوت دیا ہے اور ایک تیسرے ملک کے ذریعہ تقریباً ۶۰,۰۰۰ روپے کے کیسٹ خرید کر لے گئے ہیں اور بمبئی میں انہوں نے

ایک مکمل لائبریری قائم کی ہے۔ یہ سارے امور یقیناً "دعوت رجوع الی القرآن" کے ضمن میں انجام پا رہے ہیں اور نتائج دیکھ کر ہمارا حوصلہ بڑھا ہے۔

ایک تنظیم قائم کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ اقامت دین کے عملی تقاضوں کو پورا کیا جاسکے۔ چنانچہ ۲۸ مارچ ۷۵ء کو تنظیم اسلامی پاکستان کی تاسیس ہوئی۔ تاسیسی اجتماع میں ۶۵ سے ۷۰ تک افراد تھے۔ اس کے بعد اس میں اضافہ ہوتا رہا (گو یہ ہماری توقعات سے مطابقت نہیں رکھتا)

جناب عبدالرزاق صاحب نے تمام ذمہ دار حضرات کا مختصر تعارف بھی کرایا۔ آپ نے تنظیم کے بارے میں بتایا کہ متعلقہ نظم کے علاوہ نئے علاقوں میں تنظیم کا تعارف کرانے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔

تنظیم نے ستمبر ۹۱ء میں اسلامی انقلاب کے قیام کے لئے ایک عوامی تحریک برپا کرنے کی غرض سے تحریک خلافت کا آغاز کیا۔ عوامی جلسوں کے ذریعے اس کا تعارف کرایا گیا اور نشر و اشاعت کی مہم چلائی گئی۔ اس ضمن میں ملک بھر میں جلسے جلوس منعقد کئے گئے۔ حال ہی میں "تحریک خلافت" کو باقاعدہ رجسٹر کرایا گیا ہے۔ اب یہ ایک نیم خود مختار رجسٹرڈ باڈی ہے۔ اس کا جدید انتظامی ڈھانچہ زیر تشکیل ہے۔ اسی ضمن میں اب خلافت کمیٹیاں قائم کی جارہی ہیں۔ بعد ازاں آپ نے سوالات کے جوابات بھی دیئے۔ ۲:۰۰ بجے چائے کے وقفہ کا اعلان ہوا۔

۲:۳۰ بجے آج کے پروگرام کی آخری نشست تعارف پر مشتمل تھی۔ ہر رفیق اپنا نام، پاکستان میں اپنا پتہ اور مختصر تعارف بیان کرتا۔ دوسرے رفقاء کو وضاحتی سوالات کرنے کی بھی اجازت تھی۔ اس طرح جمعرات ۱۱ مارچ ۹۳ء والی نشست جمعہ ۱۲ مارچ ۹۳ء صبح تقریباً ۳:۳۰ بجے اختتام پذیر ہوئی۔ اس کے بعد مرکز سے تمام رفقاء ایک مقامی ریسٹورنٹ (پاک غازی ریسٹورنٹ) تشریف لے گئے جہاں سحری کا انتظام تھا۔ یہاں سے مقامی رفقاء اپنے گھروں کو، مہمان حضرات مرکز کو اور جناب اشرف فاروق صاحب مع چند دیگر ساتھیوں کے ابو ظبی کو روانہ ہوگئے۔ اس کے بعد یہ پروگرام اب ابو ظبی اور شارجہ میں بیک وقت چلنا ہے۔ شارجہ کے پروگرام کے آرگنائزر جناب محمد ظریف صاحب تھے اور ابو ظبی کے جناب اشرف فاروق صاحب۔ جناب ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نماز جمعہ سے فارغ ہو کر شارجہ سے ابو ظبی تشریف لے گئے۔ پروگرام کا باقی حصہ انہوں نے وہاں Conduct کرنا تھا اور جناب عبدالرزاق صاحب نے اسے شارجہ میں جاری رکھنا تھا۔

۱۲ مارچ ۹۳ء بروز جمعہ

نماز عشاء و تراویح سے فارغ ہو کر رات دس بجے پروگرام کا آغاز ہوا۔ شارجہ کے علاوہ

راس الخیمہ اور دبئی سے بھی رفقاء تشریف لائے تھے۔ آج کا موضوع تھا "اسلام کا انقلابی فکر"۔ یہ موضوع تھا اس مطالعہ کا جو کہ میثاق دسمبر ۹۲ء سے کیا گیا۔ یہ مطالعہ جو کہ آڈیو کیسٹ کے ذریعہ کیا گیا کراچی میں منعقد کئے گئے پروگرام کی ریکارڈنگ تھی۔ جناب مختار حسین فاروقی صاحب پڑھ رہے تھے اور حسب ضرورت جناب امیر محترم وضاحت فرماتے تھے تاکہ رفقاء اس فکر کو سمجھنے کی بہتر پوزیشن میں ہوسکیں۔ اس مضمون کے خاتمہ پر باہم مذاکرے اور افہام و تفہیم کے لئے تمام شرکاء کو تین گروہوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر گروہ کا ایک سربراہ بنایا گیا۔ ہر گروپ میں الگ الگ بحث کی گئی۔ جن رفقاء پر بات واضح ہو چکی تھی' انہوں نے ان سوالات کے تشفی بخش جوابات دیئے۔ یہ بحث و تمحیص ختم ہوتے ہی پروگرام ختم کیا گیا۔ اس وقت صبح کے ۲.۰۰ بج چکے تھے۔ راس الخیمہ اور دبئی والے ساتھی فوراً ہی روانہ ہوگئے۔

۱۳ مارچ ۹۳ء بروز ہفتہ

حسب معمول آج بھی پروگرام دس بجے شروع ہوا۔ آج کے مطالعہ کا موضوع تھا "فکر اقبال کی تعمیل کا تاریخی جائزہ" جو کہ میثاق جنوری ۹۳ء میں شائع ہوا تھا۔ مطالعہ اور بحث کی ترتیب ویسی تھی جیسی کہ گذشتہ شب تھی۔ آج رفقاء کو زیادہ اشکالات نہیں تھے' لہٰذا مطالعہ اور مباحثہ دونوں ایک بجے مکمل ہوگئے۔ بعد ازاں عبدالرزاق صاحب نے سارے مضمون کا خلاصہ بھی پیش کیا اور آج کی محفل کے برخاست ہونے کا بھی اعلان کیا۔ دبئی اور راس الخیمہ کے رفقاء اسی وقت روانہ ہوگئے۔

۱۴ مارچ ۹۳ء بروز اتوار

آج کا موضوع تھا "جماعت اسلامی کی تاریخ کا تیسرا اور شدید ترین بحران"۔ یہ بھی ماہنامہ "میثاق" میں طبع شدہ ایک مضمون تھا۔ اس کے مطالعہ کے بعد ہونے والا مباحثہ اور غور و فکر دلچسپ بھی تھا اور فکر انگیز بھی۔ رفقاء وہاں پہنچ جانے کی برابر شعوری کوشش کر رہے تھے جہاں امیر محترم کا مضمون قارئین و رفقاء کو پہنچانا چاہتا ہے۔ بحیثیت تنظیم ہمارے لئے جماعت اسلامی کی تاریخ میں بہت سا سامان درس و عبرت موجود ہے۔ غور و فکر آج بھی دو گروہوں میں الگ الگ کیا گیا۔

۱۵ مارچ ۹۳ء بروز سوموار

آج کا موضوع "اسلام کی نشأۃ ثانیہ: کرنے کا اصل کام" تھا۔ یہ بھی امیر محترم کی ایک پرانی تحریر تھی جس کا مطالعہ کیا گیا۔ مطالعے اور مباحثے کے بعد جناب عبدالرزاق صاحب نے خلاصہ بیان کیا اور ساتھ ہی رفقاء سے بھی مختصراً بیان کرنے کو کہا۔ جناب محمد ناصر' جناب محمد

ظریف (شارجہ) اور جناب فاروق صدیق (دبئی) نے اختصار کے ساتھ مطلوبہ نکات پر بات کی۔ یہ آج کے پروگرام کی گویا آخری آئٹم تھی۔ حسب سابق راس الخیمہ اور دبئی کے رفقاء فوراً ہی روانہ ہوگئے۔

۱۶ مارچ ۹۳ء بروز منگل

آج کے پروگرام میں کوئی مطالعہ یا مباحثہ شامل نہیں تھا' بلکہ آج کراچی میں منعقدہ ریفریشر کورس کا آخری پروگرام ویڈیو کیسٹ کے ذریعہ دکھایا گیا۔ اس پروگرام میں جناب سراج الحق سید صاحب کا شرکاء سے مختصر خطاب اور امیر محترم کے سیاسی تبصروں پر رائے اور تبصرہ شامل تھا۔ بہرحال سیاسی تبصروں کی افادیت کو شارجہ کی تربیت گاہ / ریفریشر کورس میں بھی تسلیم کیا گیا۔

جناب سید صاحب کے بعد امیر محترم کی تقریر تھی جو کہ بہت اثر انگیز تھی۔ میرا تاثر یہ ہے کہ جتنا کام باقی مطالعے نے ۵ دن میں کیا اس سے زیادہ اس ایک تقریر نے کر دکھایا۔

اسی پروگرام کے دوران جناب امیر محترم امریکہ سے واپسی پر عمرہ کی ادائیگی اور حرم شریف میں اعتکاف کرنے کے بعد تقریباً ساڑھے دس بجے شارجہ مرکز میں تشریف لائے اور پھر دوران وقفہ ہمارے ساتھ مصروف گفتگو رہے۔ امیر محترم اس وقت گویا تازہ دم تھے اور طبیعت بشاش تھی۔ وقفہ ختم ہوتے ہی امیر محترم اپنے کمرے میں چلے گئے اور رفقاء نے امیر محترم کی تقریر (ویڈیو کیسٹ) پر بس مختصریات کی اور اس طرح آج کی نشست بھی اختتام پذیر ہوئی۔

۱۷ مارچ ۹۳ء بروز بدھ

کل امارات سطح پر اجتماع آج ابو ظہبی میں تھا' جہاں افطار اور کھانے کا بھی اہتمام تھا۔ تراویح وغیرہ سے فراغت کے بعد امیر محترم کے ساتھ "توسیعی مشاورت" کے عنوان سے ایک نشست تھی جو حسب پروگرام دس بجے شروع ہوئی۔ اس میں ع صلائے عام تھی یاران نکتہ داں کے لئے اور خطاب براہ راست امیر محترم سے تھا۔ نشست کا آغاز جناب محمد خالد صاحب ناظم حلقہ امارات نے کیا اور مختصراً اعداد و شمار پیش کئے۔ جن کا ذکر عام قارئین و رفقاء کے لئے دلچسپی کا باعث ہوگا۔ آپ نے بتایا کہ اس وقت امارات میں:

I رفقاء کی کل تعداد ۱۳۱ ہے جن میں ۶۲ ملتزم ہیں
II "میثاق" کے خریداروں کی کل تعداد ۱۳۲ ہے
III "حکمت قرآن" کے خریداروں کی کل تعداد ۳۱ ہے
IV "ندائے خلافت" کے خریداروں کی کل تعداد ۴۸ ہے

v مرکزی شوریٰ کے ارکان کی تعداد ۱۳ ہے

آپ کے بعد جناب عبدالرزاق صاحب ناظم اعلیٰ تنظیم اسلامی پاکستان نے مختصر خطاب کیا اور رفقاء سے کہا کہ نظام العمل کی روشنی میں انہیں تنظیم کے کسی بھی عہدیدار پر تنقید کی کھلی دعوت ہے۔ ازاں بعد امیر محترم نے مشورے اور تنقید کی اہمیت اور پس منظر کی وضاحت کی اور یہ بھی فرمایا کہ امیر مشورے کا محتاج ہوتا ہے اس لئے مامور کو مشورہ دینے کا فرض ادا کرنا چاہئے۔ ترتیب یہ بنی کہ پہلے ان تمام رفقاء نے جنہوں نے کچھ کہنا تھا اپنے نام درج کرائے۔ پھر یہ ساتھی باری باری مائیک پر آکر اظہار خیال کرتے رہے۔ خطاب براہ راست امیر محترم سے تھا۔ بات کہنے سے قبل ہر ساتھی کو اپنا مختصر تعارف بھی کرانا تھا۔ اس پروگرام میں ہر طرح کی باتیں سامنے آئیں۔ تنقیدیں' تجویزیں' مشورے' آراء اور تبصرے وغیرہ۔ اس میں مختلف جگہوں سے ۲۰ رفقاء نے حصہ لیا۔ چائے کے وقفے کے بعد امیر محترم نے "علم کی حقیقت و ماہیت اور اس کی اقسام" پر حدیث نبوی کی روشنی میں سیر حاصل اور مدلل گفتگو فرمائی۔ آپ کے خطاب کے ساتھ ہی آج کی نشست بوقت دو بجے اختتام پذیر ہوئی۔

۱۸ مارچ ۹۳ء بروز جمعرات

آج کے پروگرام کے دو سیشن تھے۔ پہلی نشست رات دس بجے شروع ہوئی۔ اس میں امیر محترم نے علم کی اقسام پر بحث کی اور ڈایاگرام کی مدد سے اس کی وضاحت کی۔ (یہ دراصل گذشتہ رات کی مختصر تقریر ہی کا تسلسل تھا۔) دوسری نشست میں رفقاء کی طرف سے گزشتہ روز پوچھے گئے سوالات کے جوابات تھے۔ یہ نشست صبح تین بجے اختتام پذیر ہوئی۔ سحری کھانے کے فوراً بعد شارجہ اور العین کے رفقاء روانہ ہوگئے۔ شارجہ کے ساتھیوں نے واپس پہنچ کر ابھی شام کی تقریب کے لئے کام بھی کرنا تھا۔

۱۹ مارچ ۹۳ء بروز جمعہ

آج شام عصر کی نماز کے بعد چیدہ چیدہ لوگوں کو پاک غازی ریسٹورنٹ میں مدعو کیا گیا تھا جہاں اس ریسٹورنٹ کے مالکان نے اپنی طرف سے افطار پارٹی کا اہتمام بھی کر رکھا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختصر خطاب سورہ البقرہ کی روشنی میں بنی اسرائیل اور موجودہ امت مسلمہ کا تاریخی تقابل کرتے ہوئے ان کے حالات و واقعات پر روشنی ڈالی اور مسلمانوں کو دعوت فکر دی۔

بعد ازاں امیر محترم جناب ڈاکٹر عبدالخالق' جناب عبدالرزاق اور جناب محمد خالد کی معیت میں رات ساڑھے گیارہ بجے پاکستان روانہ ہوگئے۔

(مرتب: فاروق زمان ملک' شارجہ)

بقیہ: عرضِ احوال

نسیان کی زینت بن جائے گا اور پاکستان میں برسرِعمل دینی احیائی تحریکوں کو کچلنے کی ہر ممکن کوشش حکومتی سطح پر کی جائے گی۔ اس لئے کہ امریکہ ہو یا یہودی پالیسی ساز ادارے' انہیں جو چیز سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ اسلام کا ہمہ گیر حرکی تصور ہے جو سیکولرازم کی جڑوں پر تیشہ بن کر گرتا ہے اور جسے نظامِ باطل کا وجود ایک دن کے لئے بھی گوارا نہیں۔ ہاں اسلام اگر عیسائیت کی طرح محض ایک 'مذہب' بن کر رہ جائے جسے ملکی' سیاسی' سماجی و معاشی نظام سے کوئی سروکار نہ ہو اور جو ان کے سودی معیشت پر مبنی سیکولر نظام کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکے تو وہ مسلمانوں سے کچھ تعرض نہ کریں گے بلکہ انہیں سودی معیشت کے پیچ و خم میں مزید الجھانے کے لئے بڑی فراخی سے سرمایہ فراہم کریں گے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ع

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

☆

ملکی صورت حال پر امیر تنظیم اسلامی نے ۲۸ر مئی کے خطاب جمعہ کے آخری حصے میں جو مختصر تبصرہ کیا تھا اس کا پریس ریلیز قارئین کے لئے پیش خدمت ہے:

لاہور ۲۸ مئی: تنظیم اسلامی کے امیر اور تحریک خلافت پاکستان کے داعی ڈاکٹر اسرار احمد نے ملکی سیاست کے منظر میں واقع ہونے والی اس تبدیلی کا خیر مقدم کیا ہے جس کا سبب عدالت عظمیٰ کا فیصلہ بنا تاہم ان کے تجزیئے کے مطابق بحران ابھی ختم نہیں ہوا جس کا واحد سادہ حل نئے انتخابات کے ذریعے عوام سے نیا مینڈیٹ لینا ہے۔ مسجد دارالسلام باغ جناح میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ عدالت عظمیٰ کے فیصلے نے ہماری عدلیہ کے وقار کو بلند کیا اور اس امید کو نئی زندگی بخشی ہے کہ قومی زندگی کے مشکل مرحلوں میں عدلیہ کے کردار پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ عدالتی فیصلے کی تنفیذ میں اگرچہ صدر مملکت نے بھی تعاون کیا تاہم فوج کا کردار مثالی رہا ہے اور انہی دو عوامل نے انتقال اقتدار کو تو اتنا آسان کر دیا کہ لمحوں میں کام مکمل ہو گیا اور کسی پیچیدگی کا سامنا نہیں ہوا لیکن وفاق کے ساتھ صوبوں کا تعلق پہلے

کے مقابلے میں کہیں زیادہ نازک صورت اختیار کر گیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ بحران ابھی ختم نہیں ہوا۔ امیر تنظیم اسلامی نے کہا کہ چھوٹے صوبوں کی مرکز کے ساتھ تھوڑی بہت کشمکش پہلے بھی موجود تھی لیکن پنجاب کی صوبائی حکومت میں تبدیلیوں نے اس بحران کی شدت میں جو اضافہ کیا ہے اس کا مداوا صرف نئے عام انتخابات سے کیا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وطن عزیز کے دوسرے بہی خواہوں کی طرح میرا خیال بھی یہی ہے کہ ملکی سیاست کو نئے سرے سے صحت مند خطوط پر چلانے کے لئے آزادانہ اور منصفانہ انتخابات اب بھی وقت کی ضرورت ہیں جو ایک خالص غیر سیاسی اور غیر جانبدار عبوری حکومت کی نگرانی میں فوج کے ذریعے کرائے جائیں۔ اس کے سوا جو بھی تدبیر کی گئی اس کے اثرات عارضی ثابت ہوں گے۔

پاکستان اسلامک فرنٹ کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اسرار نے کہا کہ قاضی حسین احمد جن مسائل کو لے کر کھڑے ہوئے ہیں ان کی سنگینی سے کسی بھی باشعور شہری کو انکار نہیں۔ امریکی دباؤ کا مقابلہ اور جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی ملکی سیاست پر اجارہ داری کا خاتمہ واقعی ضروری ہے اور اس ضمن میں انہوں نے جو تیسری بات کہی اصولاً وہ بھی غلط نہیں۔ مذہبی جماعتوں کا اتحاد قائم کرنے کی بجائے مخلص اور اسلامی ذہن رکھنے والے کارکنوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ایک اچھی تجویز ہے کیونکہ جماعتوں کی قیادت کے سامنے ترجیحات مختلف ہوتی ہیں اور ان کے درمیان اتفاق رائے پیدا کرنا آسان نہیں ہوتا جبکہ ایک عام کارکن کا معاملہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ ڈاکٹر اسرار نے کہا کہ سوال اس پر یہ پیدا ہوتا ہے کہ الیکشن کے ذریعے اقتدار میں آنے والی کوئی جماعت کیا یہ مقاصد حاصل کر بھی سکتی ہے۔ الیکشن میں کامیابی صرف اسی صورت میں ممکن ہوتی ہے جب مروجہ نظام کے تقاضے پورے کئے جائیں۔ الجزائر کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر اسرار نے کہا کہ وہاں کے حالات بالکل جدا تھے۔ وہاں فرقہ واریت تو موجود تھی ہی نہیں اور جاگیرداری کو آزادی کے فوراً بعد سوشلسٹ حکومت نے ختم کر دیا تھا جبکہ ہمارے ہاں مذہبی جماعتیں قائم ہی فرقہ واریت کی بنیاد پر ہیں اور سیاست یہاں ہمیشہ جاگیرداروں کا کھیل رہی ہے۔

قبل ازیں ڈاکٹر اسرار احمد نے حج اور قربانی کی دینی حیثیت پر روشنی ڈالی اور اس ضمن میں یہ بھی کہا کہ بعض حلقوں کی طرف سے اٹھایا جانے والا یہ سوال

واقعی قابل غور ہے کہ رمضان المبارک اور عیدالفطر کے برعکس جن کا تعین رویت ہلال کے ساتھ مشروط ہے، یوم عرفہ اور یوم نحر یعنی عید قربان کو دنیا بھر کے مسلمان انہی دنوں میں کیوں نہ منائیں جن میں وہ عرفات اور منیٰ کے مقامات پر منائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ اس سوال کا سرسری جواب کافی نہیں تاہم جب تک امت مسلمہ کسی عالمی مقتدر ادارے کی تشکیل نہ کرے ایسے معاملات پر آخری فیصلے نہیں کئے جاسکتے ورنہ کم سے کم یہ تو ضروری ہے کہ دنیا بھر سے فقہاء کو ایک جگہ جمع کر کے ان سے متفقہ فارمولے مرتب کرائے جائیں۔ اس سے پہلے انفرادی آراء بدستور ناقابل عمل سمجھی جائیں گی اور ہم مجبور رہیں گے کہ امت میں رائج موجودہ طریقوں کی ہی پیروی کرتے رہیں۔ ○

خطوط و نکات

پروفیسر اشفاق علی خاں کا مکتوب، امیر تنظیم کے نام

عزیز محترم گرامی منزلتہٗ سلامت باشد

بعد سلام مسنون کے مطالعہ کریں کہ ماہنامہ میثاق کا دسمبر ۱۹۹۲ء کا شمارہ نظر سے گزرا۔ آپ کی جانی پہچانی طرز نگارش کا اثر دل پر کچھ ایسا ہوا کہ غریب الوطنی، طویل العمری اور بیماری سے پیدا ہونے والی یاسیت اور حزن میں افاقہ محسوس کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی پناہ میں رکھے اور اس سے بھی بلند تر درجات عطا فرمائے۔

حالیہ سلام روستائی کی غرض یہ ہے کہ ایک تکلیف دوں۔ دو چیک "میثاق" اور "ندائے خلافت" کے چندے کے لف ہذا ہیں۔ انہیں متعلقہ اہل کار حضرات کو بھجوا سکیں کہ پرچوں کا اجراء میرے نام ہوسکے تو عنایت ہوگی۔ اگر اس گزارش میں کسی سہو کا پہلو ہو تو درگزر کر دیجئے۔ چھہتر برس کی عمر میں "از بزرگاں خطا......"

دعاگو۔۔ احقر

اشفاق علی خان سابق مدرس

تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام چار روزہ توسیعی مشاورت

احباب نوٹ فرمالیں کہ ان شاء اللہ العزیز ۲۷ تا ۳۰ جون تنظیم کے مرکزی دفتر واقع ۶۷۔ اے علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور منعقد ہوگی۔ ۲۷ جون کو صبح ۹ بجے مشاورت کے پروگرام کا آغاز ہوگا۔

بقیہ: الہدیٰ

یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ ابو جہل نے عین میدان بدر میں جو دعا مانگی تھی تو اس میں تعلقات کے انقطاع ہی کی دہائی دی تھی۔ وہ دعا اس اعتبار سے بھی بڑی عجیب ہے کہ اس نے وہاں کسی لات' عزیٰ' ہبل یا کسی منات کو نہیں پکارا بلکہ صرف اللہ کو پکارا:

"اَللّٰھُمَّ اَقطَعنا لِلرَّحِم فَاَھِنہُ الیوم" اے اللہ جس شخص نے ہمارے رحمی رشتے کاٹ دیئے اسے آج رسوا کر دے!۔ وہ دہائی دے رہا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کے خلاف اور اس کے نزدیک آنحضور ﷺ کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ آپؐ نے باپ کو بیٹے سے جدا کر دیا' بھائی کو بھائی سے علیحدہ کر دیا' بیویوں اور شوہروں میں جدائی ڈال دی۔ اور اس طرح قریش کی قبائلی جمعیت منتشر ہو کر رہ گئی' ان کا شیرازہ پراگندہ ہو کر رہ گیا۔ یہ ہے وہ معاملہ جس کے لئے ان نوجوانوں کے دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے۔ تم اگر اپنے عزیز رشتہ داروں سے کٹے ہو تو سوچو کہ نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ سے جڑے بھی ہو! تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہوئی ہے جنہیں سورۃ الفاتحہ میں "منعم علیہم" قرار دیا گیا اور وہ منعم علیہم کون ہیں؟ اس کا جواب سورۃ النساء کی آیت میں ہے:

وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ○

کہ اپنے آباء و اجداد سے اگر تم کٹ گئے' اپنے بھائی بندوں سے تمہارا تعلق منقطع ہو گیا تو ملول و غمگین نہ ہو۔ تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہو گئی ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے۔ روز قیامت تم انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور نیکو کاروں کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے اور ان کے ساتھ جنت الفردوس میں تمہارا داخلہ ہو گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے لوگوں میں شامل فرمائے: وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّۃَ مَعَ الْاَبْرَارِ یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ !!

28/16/34

[stamp]

سانحۂ کربلا

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی عزیمت و عظمت کی صحیح تصویر

شہیدِ مظلوم

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب اور آپ کی مظلومانہ شہادت کے بیان پر جامع تالیف

- یہود نے عہدِ صدیقیؓ میں جس سازش کا بیج بویا تھا، آتش پرستانِ فارس کے جوشِ انتقام نے اسے تناور درخت بنادیا۔
- وہ آج بھی قاتلِ خلیفۂ ثانی ابولؤلؤ فیروز مجوسی کی قبر کو متبرک سمجھتے ہیں
- علی مرتضیٰؓ کی طرح حضرت حسینؓ بھی قاتلینِ عثمانؓ کی سازش کا شکار ہوئے
- سیدالشہداء کون ہیں اور شہیدِ مظلوم کون؟ تاریخی حقائق کو سمجھنے کے لیے

امیر تنظیمِ اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو جامع اور مختصر مگر عام فہم اور محققانہ تاریخی کتابوں

کا مطالعہ کیجئے

قریبی بک سٹال سے طلب کیجئے یا ہم سے منگوائیے

دونوں کتابوں کے سیٹ کی مجموعی قیمت

صرف -/۱۶ روپے (سستا ایڈیشن -/۸ روپے)

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن ۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن لاہور
فون: ۸۵۶۰۰۳

MONTHLY
Meesaq
LAHORE

REGD NO. L 7360
VOL. 42 NO. 6
JUNE 1993